وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ

اور تم نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو

راہ نما

برائے

ایم، اے اسلامیات

سال اوّل

شہزادی شمع کریم - کراچی پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۸۹۰۸ کراچی

آغاز پرنٹرس کراچی

اس کتاب میں

۲۹۹

پرچہ اول

انتساب

میں اپنی اِس حقیر کوشش کو اس ہستی سے منسوب کرتی ہوں
جس کی رفاقت نے میری زندگی کی راہوں کو روشن کر رکھا ہے،
جو میرے سر کا تاج ہے اور جس کی ہمت افزائی اور محبت نے مجھے اس
مرتبے پر پہنچایا ہے۔

حرفِ اوّل

میرے طالبعلم ساتھیو!

یہ جو کچھ میں آپ کے مطالعہ کیلئے پیش کر رہی ہوں میری کوئی تصنیف نہیں اور نہ امتحانی پرچے ہیں بلکہ میں نے جو کورس کی کتابیں مثلاً حجۃ اللہ البالغہ، تجرید بخاری اور فلسفۂ اسلام وغیرہ پڑھیں اور جو کچھ میرے استاد جناب عبدالرشید ایم اے (اسلامیات) گولڈ میڈلسٹ نے میری امتحانی تیاری کے دوران مجھے پڑھایا وہ سب آپ تک پہنچا رہی ہوں۔

میں خود چونکہ پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے امتحان میں شریک ہوئی تھی۔ اس لئے ان مشکلات کو مدِنظر رکھتے ہوئے جو ایک پرائیویٹ امیدوار کو درپیش ہوتی ہیں میں نے یہ جسارت کی کہ اپنی پڑھائی کو ایک کتابی شکل میں یکجا کر دوں جو امتحانی نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔

میرے وہ بھائی اور بہنیں جن کے دل میں علم حاصل کرنے کی خواہش ہے لیکن ان کی راہ میں مجبوریاں حائل ہیں وہ اس کتاب سے استفادہ کر کے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں اس کتاب میں جو کچھ تحریر ہے وہ ایم اے اسلامیات سال اوّل کراچی یونیورسٹی کے سلیبس کے عین مطابق ہے۔

عزیز طالبعلم ساتھیو!

یقین کیجیئے میں نے یہ کام نیکی بھلائی اور فی سبیل اللہ کیا ہے اس لئے اس کتاب کی کوئی قیمت نہیں رکھی اور ضرورت مند طلبہ کو مفت دی جائے گی۔ آپ سے التماس ہے کہ میرے حق میں دعا کریں خداوند کریم میرے علم کی شمع کو فروزاں رکھے۔ آمین

یہ بھی دُعا کیجیئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے توفیق دے کہ میں ایم اے فائنل کے طلبہ کیلئے بھی ایسی ہی کوشش کر سکوں۔ آمین

آپ کی بہن

شہزادی شمع کریم

کراچی۔ بروز جمعہ ۱۴ فروری ۱۹۷۵ء

حروفِ مقطعات

الف - لام - میم اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ جو کہ مختلف سورتوں کے شروع میں آئے ہیں مثلاً الٓرٰ - کھیعص وغیرہ - یہ سب حروفِ مقطعات کہلاتے ہیں ان کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض تابعین کے نزدیک الم مخفف اور قائم مقام ہے۔

بعض کے نزدیک یہ سورتوں کے نام ہیں، لیکن خلفائے راشدین اور عبداللہ بن مسعود کے نزدیک یہ اسرار قرآنی ہیں جن کے معنی عام بندوں کو معلوم نہیں۔ حضرت علی رضہ فرماتے ہیں کہ وہ ان حروف کو خدا کا نام سمجھتے تھے نیز آپ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کا ایک سر ہوتا ہے اور قرآن کا سر حروفِ مقطعات ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضہ فرمایا کرتے تھے کہ ہر چیز کا ایک راز ہوتا ہے اور قرآن کا راز اس کے حروفِ مقطعات ہیں۔ عربوں میں بھی یہ رواج تھا کہ وہ بعض الفاظ پر چیزوں کے نام رکھتے تھے جیسے نون سے مچھلی اور قاف سے ایک پہاڑ وغیرہ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کلام بھی اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ جس طرح تم ترتیب دیتے ہو۔ پھر اس جیسا کلام کیوں پیش نہیں کرتے۔ ابنِ عباس رضہ سے روایت ہے کہ الف سے مراد اللہ۔ لام سے مراد جبرائیل اور میم سے مراد محمدؐ۔ یعنی یہ قرآن خدا کی طرف سے جبرائیل کے ذریعہ حضرت محمدؐ پر نازل ہوا - اور یہ بھی کہ اس سے مراد حروف ابجد ہیں جن سے قوموں کے عروج وزوال کا حساب لگایا جاتا ہے۔ اس لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو یہود نے حساب لگا کر بتایا کہ جس قوم کا صرف ستر (۷۱) برس

کا زمانہ ہوا اس کا ساتھ کیسے دیا جا سکتا ہے۔ یہود کی یہ بات سُن کر حضور اکرم مسکرائے تو یہود نے پوچھا۔ کیا کچھ اور بھی ہے آپ نے فرمایا الٓر۔ کھیعص۔ تو یہود کہنے لگے اب تو آپ نے ہمیں شبہ میں ڈال دیا ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

الغرض الٓم اور اس طرح کے دوسرے الفاظ جو کہ حروف مقطعات کہلاتے ہیں ان کو اسی طرح تلاوت کیا جاتا ہے اور ان کے معنی کے متعلق یہ کہنا بہتر ہے کہ:۔

"واللہ اعلم بمرادہ"

متقین اور انکی خصوصیات

قرآن کریم حقیقت میں ایک ہدایت نامہ ہے اور مکمل دستور حیات ہے اور اس ہدایت سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھاسکتے ہیں جن کے دلوں میں حق کی طلب ہو۔ جن کے دل میں خوف خدا ہو۔ لیکن جس کی آنکھوں کی بینائی نہیں اس کیلیے سورج کی روشنی بیکار ہے سورۂ بقرہ کی ابتدا میں متقین کی حسب ذیل خصوصیات ذکر کی گئی ہیں۔

۱۔ یہ لوگ ان دیکھے خدا پر ایمان لاتے ہیں۔

۲۔ یہ لوگ نماز قائم کرتے ہیں۔

۳۔ جو کچھ اللہ نے انہیں عطا فرمایا اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

۴۔ جو کچھ حضرت محمدؐ پر نازل کیا گیا اس پر ایمان لاتے ہیں۔

۵۔ حضرت محمدؐ سے پہلے جن پیغمبروں کو جو ہدایات دی گئیں اور جو کتابیں ان پر نازل کی گئیں ان پر بھی ایمان رکھتے ہیں خواہ وہ کسی زمانہ کسی قوم یا کسی بھی ملک سے تعلق رکھتے ہوں اس لئے کہ مومن کے لئے صرف یہ ضروری نہیں کہ وہ آخری پیغمبر حضرت محمد کی تصدیق کرے بلکہ سارے انبیاء کی تصدیق ضروری ہے اور یہی چیز مومن کو یہود و نصاریٰ سے ممتاز کرتی ہے۔

۶۔ یہ لوگ اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ اس دنیا کے بعد ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا اور جو کچھ ہم نے اس دنیا میں اچھائی یا برائی کی ہے اس کا بدلہ مل کر رہے گا۔

متقین کی یہ خصوصیات بیان کردینے کے بعد قرآن نے بالکل وضاحت کے ساتھ بیان کردیا کہ یہی لوگ درا صل ہدایت ربانی پر گامزن ہیں اور یہی کامیاب و کامران رہیں گے۔

منافقین سورۂ بقرہ کی روشنی میں

اسلام کو مکہ میں صرف کفار قریش کا سامنا تھا۔ جو کھل کر مخالفت کر رہے تھے اور جن کا ظاہر و باطن ایک تھا لیکن جب حضور مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں کے یہودیوں نے سوچا کہ کیوں نہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اسلام کے ذریعہ دنیاوی فوائد بھی حاصل کئے جائیں اور بوقت ضرورت اسلام کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات سے بھی بچ سکیں۔

حضور کی تشریف آوری سے پہلے یہود کے ایک قبیلہ بنو خزرج کا سردار عبداللہ بن ابی سلول اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح ان قبیلوں کی سرداری اسے حاصل ہو جائے اور اس سلسلہ میں اس نے قبیلہ بنو اوس کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ قریب تھا کہ یہ سب لوگ ملکر اسے سردار بنالیں لیکن حضور کا آنا کیا ہوا کہ اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

جب عبداللہ بن ابی بن سلول نے دیکھا کہ اس کی سرداری نہ ملنے کی وجہ مسلمان ہیں تو اس نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ یہ طے کیا کہ ہم ظاہراً تو ایمان لائیں گے لیکن حقیقت میں اپنے ہی دین پر قائم رہیں گے اس طرح ہمیں مسلمانوں کی حمایت بھی حاصل رہے گی اور اپنے لوگوں کے درمیان بھی ہمیں پہلے جیسا مقام حاصل ہوگا۔ یہی لوگ منافق کہلائیں گے۔

سورۂ بقرہ کی ابتداء میں جب اللہ تعالیٰ نے متقین کا ذکر کیا اور اس کے بعد کافروں کا حال بھی بیان فرما دیا تو ضروری تھا کہ اس مار آستین سے بھی مسلمانوں کو آگاہ کر دیا جاتا جنہیں منافقین کہا جاتا ہے چنانچہ سورۂ بقرہ کے دوسرے رکوع میں ان کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی جسے چند نکات میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ منافقین کا تذکرہ شروع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو آگاہ کر رہا ہے کہ ایسے لوگ بھی تمہارے اندر موجود ہیں جو زبان سے تو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں کھوٹ بھرا ہوا ہے اور حقیقت میں وہ مومن نہیں۔

۲۔ ایک طرف تو یہ منافق اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور دوسری جانب آپس میں یہ کہتے تھے کہ دیکھا ہم مسلمانوں اور ان کے خدا کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اللہ تبارک فرماتے

ہیں یہ لوگ مسلمانوں کو نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں لیکن اپنی کم فہمی کی بنا پر نہیں سمجھتے۔ ان کو اس حقیقت کا حال اس وقت ہوگا جب دنیا میں بھی رسوا ہوں گے اور آخرت میں تو جہنم کے سب سے نیچے گڑھے میں ان کا ٹھکانہ ہوگا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ یہ سب کچھ اس لئے کر رہے ہیں کہ ان کے دل پژمردہ ہو چکے ہیں اور ان کے دلوں میں ایسی بیماری ہے کہ نہ چھپائے چھپے اور نہ بتائے بنے اور ان کی اس سرکشی کی بنا پر یہ مزید گمراہ ہوتے جا رہے ہیں۔

۴۔ جب منافقین کے جھوٹے ایمانی دعووں کا ذکر ہو چکا اور مسلمانوں کو ان کی حقیقت معلوم ہو چکی تو مسلمانوں نے ان سے کہا کہ دیکھو تم دو رخا پن سے باز آجاؤ اور اللہ کی زمین میں فساد مت پھیلاؤ خود بھی سکون سے رہو اور اللہ کے نیک بندوں کو بھی سکون سے رہنے دو۔ تو بجائے اس کے کہ منافقین اس نیک مشورہ پر عمل کرتے کہنے لگے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ تو خدا مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان منافقین سے ہوشیار رہو یہی فسادی ہیں۔

۵۔ منافقین اپنی چالوں میں اس طرح پینترے بدلتے تھے کہ جب مسلمانوں کے پاس آتے تو کہتے کہ ہم تو تمہارے مسلمان ساتھی ہیں۔ اور اس طرح مسلمانوں کو حاصل ہونیوالے فوائد میں شریک ہوتے لیکن جب اپنے منافقین کے پاس جاتے تو قسمیں کھا کر کہتے کہ حقیقت میں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں اور مسلمانوں سے تو ہم مذاق کر رہے ہیں۔

۶۔ منافقین کے اس مذاق کا جواب اللہ جل شانہ بھی خوب دے رہا ہے کہ لے بیوقوفو! انہیں کیا ہو گیا ہے بھلا تم کیا مذاق کرو گے اللہ تو مسلمانوں کو تمہارے کرتوتوں سے آگاہ کر رہا ہے اور تمہارے ساتھ یہ مذاق ہوگا کہ نہ دنیا کے رہو گے اور نہ آخرت کے گویا یہ مذاق تم مسلمانوں سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے کر رہے ہو۔

اللہ یستھزی بھم ویمدھم فی طغیانھم یعمھون۔

۷۔ منافقین اپنے آپ کو بڑا ہوشیار سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے ساتھ وقتی طور پر مل کر ہم دنیاوی فائدہ حاصل کر رہے ہیں اور اگر مسلمانوں کو زوال آگیا تو پھر اپنے ساتھیوں سے جا ملیں گے اس طرح ہمیں فائدہ ہی فائدہ ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ بات یہ نہیں بلکہ اے منافقین تم تو بڑے ہی گھاٹے کا سودا کیا ہے کہ ہدایت جیسی بے بہا دولت دیکر گمراہی جیسی حقیر شے خریدی ہے اور تم نے ایک

ایسی تجارت کی ہے کہ جس میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔

(۸) منافقین کی مختلف چالوں کو بیان کرنے کے بعد ان کو تمثیلاً پیش کیا جارہا ہے کہ ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسا کوئی شخص اندھیری راتوں میں راستہ تلاش کرے اور جونہی وہ راستہ ڈھونڈنے کے لئے روشنی کرے اور عین اس وقت جبکہ پورا ماحول روشنی سے منور ہو جائے اور ہر چیز صاف اور واضح دکھائی دے تو عین اس وقت اس کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہے۔ بالکل یہی حال منافقین کا ہے کہ خدا نے اسلام کی روشنی سے دنیا کو منور کر دیا۔ بجائے اس کے کہ یہ اس روشنی سے فائدہ حاصل کرتے یہ بدبخت دنیاوی لالچ میں کھو گئے اور پھر خدا نے ان کی ریشہ دوانیوں سے مسلمانوں کو آگاہ کر کے ان کی سب امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

۹۔ ایک اور مثال بیان فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تو بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔ بہرے اس لئے ہیں کہ روح کو تازگی بخشنے والی باتوں کی طرف دھیان ہی نہیں دیتے۔ گونگے اس لئے ہیں کہ اپنے دل کی بیماری کو بیان نہیں کر پاتے اور اندھے اس لئے ہیں کہ حضور صلعم کے کئی معجزات ان کی آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

۱۰۔ منافقین کے حال کو اب ایک ایسی بارش سے تشبیہ دی جاتی ہے جس میں خوب اندھیریاں ہوں، بجلی کی چمک اور گرج و کڑک ہو اور دل ہلا دینے والی گڑگڑاہٹ ہو۔ جس سے یہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔

یعنی یہ منافقین اسلام میں پیش آنے والی مشکلات کے وقت کوئی نہ کوئی حیلہ سازی کر کے الگ ہو جاتے ہیں لیکن جب فائدہ حاصل کرنے کا وقت آتا ہے تو سب سے آگے آگے نظر آتے ہیں۔

خدا ان سے کہہ رہا ہے کہ تم خواہ کچھ ہی رنگ کیوں نہ بدلو اللہ تمہیں گھیرے ہوئے ہے اور اس کے عذاب سے بچ کر تم کہیں نہیں جا سکتے۔ اس لئے کہ:۔

ان اللہ محیط بالکٰفرین

بنی اسرائیل پر نازل کردہ انعامات

بنی اسرائیل وہ قوم ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے بے پناہ نعمتیں نازل فرمائیں لیکن اس قوم نے شکر ادا کرنے کے بجائے ہمیشہ نافرمانی کی جس کی بنا پر یہ ذلیل و خوار ہوئی۔

حضرت موسیٰ کے زمانے میں اس قوم پر حیرت انگیز نعمتیں اتریں جن کا تذکرہ سورہ بقرہ کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ تمام عالم پر انہیں فضیلت بخشی یعنی ان کو نبوت و سلطنت دونوں سے نوازا گیا لیکن انہوں نے تکبر و سرکشی کو اختیار کیا جس کی بنا پر ان کی سلطنتوں کا نام و نشان مٹ گیا اور پیغمبروں کی بعثت بھی اس قوم میں سے ختم کر دی گئی۔

۲۔ حضرت موسیٰ سے پہلے فرعون ان لوگوں کا حاکم تھا جس کے حکم سے اس قوم میں ہر پیدا ہونیوالا بچہ قتل کر دیا جاتا اور بچی کو زندہ رہنے دیا جاتا تاکہ اس سے خدمت لے سکیں حضرت موسیٰ کے آنے پر اللہ نے ان کو اس عذاب الیم سے چھٹکارا دیا۔

۳۔ جب حضرت موسیٰ نے ان کو فرعون سے نجات دلائی اور اس کے عذاب سے چھٹکارا دلا کر جب مصر سے روانہ ہوئے اور بحیرہ قلزم کے کنارے پہنچے تو پیچھے فرعون بھی آ پہنچا۔ اس موقع پر بنی اسرائیل کی ہلاکت یقینی تھی لیکن خدا نے بحیرہ قلزم میں بنی اسرائیل کے لئے راستہ بنا دیا اور جب فرعون بھی دریا میں اترا تو مع اپنی قوم اور ساز و سامان کے موجوں کی نذر ہو گیا اور بنی اسرائیل یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

۴۔ جب بنی اسرائیل صحرائے سینا کے لق و دق بیابان میں پہنچے تو گرمی اور دھوپ نے انہیں بے چین کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ انعام کیا کہ سایہ کیلئے بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا جو بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ چلتا۔

۵۔ بنی اسرائیل نے جب گرمی اور دھوپ سے نجات پائی تو ان کے لئے پانی کا مسئلہ تھا۔ جس کے بغیر جینا ناممکن تھا تو اللہ نے نہ صرف پانی کا انتظام فرما دیا بلکہ جھگڑے سے بچانے کے لئے ہر قبیلہ کیلئے الگ الگ چشمہ چٹان سے جاری کر دیا۔ یہ کل ۱۲ چشمے تھے۔

۶۔ اب بنی اسرائیل کے سامنے پیٹ کا مسئلہ تھا اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت کی اور بغیر محنت و مشقت

کے انہیں من وسلویٰ کی خوراک حاصل ہوگئی۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو چالیس راتوں کے لئے کوہ طور پر طلب کر لیا اور اس نافرمان قوم نے اللہ کی ہدایت کا انتظار کئے بغیر اور ہارونؑ کے منع کرنے کے باوجود ایک بچھڑا بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔ جب موسیٰؑ واپس کوہ طور سے لوٹے اور قوم کو اس حال میں دیکھا تو غصے میں تورات کی لوحیں زمین پر پٹخ دیں اور قریب تھا کہ بنی اسرائیل کو اس حرکت پر ہلاک کر دیا جاتا۔ مگر صرف یہ عذاب ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کریں اور یہ معمولی سزا دیکر پوری قوم کو ہلاکت سے بچا دیا۔

۸۔ بنی اسرائیل نے موسیٰؑ سے کہا کہ ہم تمہارے خدا پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک اسے نہ دیکھ لیں۔ اس موشگافی پر بجلی آن پڑی اور موسیٰؑ اپنی ستر آدمیوں کو لے کر آئے تھے سب کے سب ڈھیر ہو گئے۔ موسیٰؑ کی دعا کے بعد خدا نے پھر رحم کیا اور سب کو دوبارہ زندہ کر دیا۔

۔ ان تمام باتوں کے باوجود جب یہ قوم راہِ راست پر نہ آئی تو خدا تعالیٰ نے کوہ طور کو ان کے سروں پر معلق کر دیا اور کہا کہ مانو میری بات ورنہ نیست و نابود کر دیئے جاؤ گے اس وقت تو انہوں نے وعدہ کر لیا کہ اے اللہ تو ہی ہمارا رب ہے لیکن واپس آتے ہی پھر سرکشی شروع کر دی لیکن اس کے باوجود خدا کی نعمت کی بنا پر بڑے عذاب سے انہیں واسطہ نہیں پڑا۔

۱۰۔ بنی اسرائیل کو جب اتنی نعمتیں حاصل ہوگئیں اور بغیر محنت و مشقت کے ان کے کھانے پینے کا انتظام ہوگیا تو ان کو پھر مستی لگی اور اپنے پیغمبر سے کہا کہ اے موسیٰ ہم تو من وسلویٰ کھاتے کھاتے اکتا گئے ہیں ہم کو ساگ، مسور، پیاز اور چٹخارے والی چیزیں عطا کر۔ خدا نے کہا کہ نزدیک والی بستی میں جاؤ وہاں یہ سب چیزیں مل جائیں گی۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی منہ مانگی چیزیں عنایت کر دیں اور سلطنت کنعان کی حکومت بھی بخش دی۔ مگر بجائے شکریہ کے کفر و شرک اختیار کیا تو اللہ نے ان پر غضب نازل کر دیا اور دنیا بھر میں ذلیل و خوار ہوکر پھرتے رہے۔

"ضربت علیهم الذلة والمسكنة وباءو بغضب من الله"

اعجاز القرآن

اعجاز القرآن اور وقوع اعجاز القرآن سے متعلق گفتگو سے پیشتر مناسب ہے کہ چند ایسے اہم اور بنیادی نکات پیش نظر رکھے جائیں جن سے قرآن حکیم اور اس سے پہلے کی نازل شدہ کتب الٰہیہ کے درمیان فرق اور امتیازات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ اہم اور بنیادی نکات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنے سے پیشتر کی آسمانی کتابوں سے کن امور میں فرق و امتیاز رکھتا ہے، مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ قرآن سے پیشتر کی آسمانی کتابیں مکمل شریعت کی حامل نہ تھیں اور قرآن حکیم مکمل شریعت کا حامل ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی نعمت تمام ہوئی۔ کیونکہ نزول قرآن سے پہلے انسانیت رشد و شعور کے اُس مرحلے میں داخل نہیں ہوئی تھی کہ اسے مکمل شریعت کا مکلف بنا دیا جاتا۔ اسی لئے قرآن سے پیشتر کی آسمانی کتابوں کے ذریعہ انسان کو جو دین ملا تھا وہ بنیادی طور پر تو اسلام ہی تھا لیکن اپنی شریعت کے لحاظ سے اُن سانچوں میں ڈھلا ہوا تھا جو اُس عہد کے ذہنی، عقلی، اجتماعی اور تمدنی تقاضوں سے ہم آہنگ تھا پھر جیسے جیسے فطرت انسانی کے مضمرات واضح ہوتے گئے اور عقل انسانی رشد و بلوغ کی حد تک پہنچنے لگی۔ ویسے ویسے سابق شرائع الٰہیہ درجہ بدرجہ ترقی کرتی گئیں تا آنکہ جب انسان عقل و شعور کی اس منزل تک پہنچ گیا کہ اسے مکمل شریعت کا مکلف بنایا جا سکے تو پھر شریعت الٰہیہ اُس نقطۂ کمال پر پہنچ گئی جس نقطۂ کمال پر وہ قرآن میں نظر آتی ہے۔

۲۔ قرآن سے پیشتر کی کوئی آسمانی کتاب ایسی نہ تھی جو وقت کی ساری انسانی دُنیا کے لئے ہوتی بلکہ ہر کتاب اس قوم کے لئے ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتی تھی جس قوم میں وہ رسول مبعوث ہوئے جو اس کتاب کو لے کر آئے تھے اسی طرح قرآن سے پیشتر کی کوئی آسمانی کتاب رہتی دنیا تک کے لئے ہدایت نامہ کی حیثیت سے نازل نہیں کی گئی بلکہ ایک خاص مدت تک کے لئے نازل کی گئی تھی اور قرآن مجید اپنے نزول کے وقت بھی ساری دنیا کیلئے ہدایت الٰہی کی حیثیت سے نازل کیا گیا اور قیامت تک کیلئے یہ وہ واحد اور آخری کتاب ہے جو کتاب الٰہی کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳۔ قرآن مجید سے پیشتر کی ہر آسمانی کتاب جملۃ واحدۃ (یکبارگی سب کی سب) نازل ہوئیں اور قرآن کا نزول بتدریج ۲۳ سال کی مدت میں ہوا۔ چنانچہ اس طریق تنزیل پر قرآن کے مخالفین کی

کی جانب سے ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا، اور جس کی حکایت قرآن مجید نے اِس طرح کی ہے کہ :۔ وقال الذین کفروا لولا نزّل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ ۔ پھر اس کا جواب اس کے بعد ہی اس طرح دیا گیا ہے کہ کذالک لنثبت بہٖ فوادک ۔

۴۔ قرآن سے پیشتر کی کوئی کتاب الٰہی ایسی نہیں جس کی حفاظت کا خود اللہ نے وعدہ کیا ہو اور ضمانت لی ہو بلکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری ان لوگوں پر ڈالی گئی تھی جو اس پر ایمان لائے اور یہی وجہ ہے کہ انسانوں نے جب نفسانی خواہشات کے تحت ان کتابوں میں تحریف کرنی چاہی تو تحریف پر قادر ہو سکے چنانچہ اب تو بڑے بڑے مستشرقین بھی وانشگاف الفاظ میں قرآن سے پیشتر کی کتب سماویہ میں تحریف کا اعتراف کر رہے ہیں اور قرآن حکیم کی حفاظت کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔

(انا نحن نزّلنا الذکر وانا لہٗ لحٰفظون) اور یہی وجہ ہے کہ آج تک قرآن مجید کے کسی لفظ، کسی حرف، کسی حرکت اور کسی شوشے میں ادنیٰ سا ردّ و بدل اور معمولی سی تحریف پر بھی کوئی قادر نہ ہو سکا۔ اور اس کا اعتراف بھی آج اغیار تک کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں مثلاً مشہور عیسائی مستشرق سر ولیم میور اسلام کے حق میں سخت متعصب ہونے کے باوجود اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں اس طرح اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ :۔

"جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو قرآن کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔"

پھر وہ اپنی اسی کتاب میں ایک دوسرے عیسائی محقق "وان ہیمر" کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "ہم ایسے ہی یقین کے ساتھ اس قرآن کو بعینہٖ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں جیسا کہ مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں۔"

نہ صرف آج تک یہ قرآن حسب وعدۂ الٰہی ہر طرح کی تحریف سے پاک رہا۔ بلکہ قیامت تک اس کے اندر کسی جہت سے اور کسی قبیل کے باطل کے گھس آنے کا امکان نہیں۔

لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ ۔

۵۔ قرآن حکیم سے پیشتر کی کوئی آسمانی کتاب ایسی نہ تھی جو معجزہ کی حیثیت سے انسانوں کے سامنے پیش کی گئی ہو اور یہ چیلنج دیا گیا ہو کہ اس کتاب کے کسی حصے کے مثل بنا لاؤ۔ ان کتابوں کے لانے والے انبیاء و رسل کے جو معجزات تھے وہ ان کتابوں کے سوا کچھ اور تھے اور قرآن مجید بجائے خود ایک معجزہ ہے

چنانچہ بطور تحدی کہیں تو یہ ارشاد ہوا ہے کہ اگر تمام جن و انس مجتمع ہو کر اور ایک دوسرے کے مددگار بن کر بھی زور لگائیں کہ اس قرآن کے مثل پیش کریں تو نہ پیش کر سکیں گے (بنی اسرائیل - ۸۸) اور کہیں دس سورتوں کی تحدی کی گئی ہے (ہود) یہاں تک کہ سورۂ یونس میں منکرین قرآن سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو کہ یہ قرآن رسولؐ نے خود تصنیف کر لیا ہے تو اس کی ایک ہی سورہ جیسی سورہ تم بھی خود تصنیف کر لاؤ (یونس - ۳۸) اور پھر ایک ہی سورہ جیسی سورۃ بنا کر لانے سے متعلق اس تحدی کیلئے سورۂ بقرہ میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ اگر تمہیں قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں کسی طرح کا ریب و شک اور تذبذب ہے اور اسے کسی انسان کا کلام سمجھتے ہو تو ایسے تمام لوگوں کو چیلنج دیا جا رہا ہے کہ ایسی کتاب تو کجا اس کی کسی سورہ جیسی ایک سورہ ہی بنا کر لائیں اور ساتھ ہی قرآن نے اس کی پیشگی دعویٰ کیا کہ ایسے لوگ قرآن کی کسی ایک سورہ جیسی بھی کوئی سورہ بنا کر نہیں لا سکتے اور یہ پیشگوئی پہلے بھی سچی ہوئی اور آج تک جھٹلائی نہیں جا سکتی۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہٖ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین۔
فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اُعدت للکٰفرین ۔

یعنی اگر تم اس کتاب کی جانب سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے (کہ یہ ہماری ہے یا نہیں) تو اس کے مانند ایک ہی سورۃ بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جن کو تم نے اپنا حمایتی سمجھ رکھا ہے اپنے ان سارے ہم نواؤں کو بھی اپنی مدد کیلئے بلا لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ کبھی نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لئے ۔

دنیا جانتی ہے کہ معاندین اسلام نے اسلام کے خلاف کیا کچھ نہیں کیا۔ لیکن وہ قرآن کی کسی چھوٹی سے چھوٹی ایک سورہ جیسی سورۃ تک بھی بنا کر پیش نہ کر سکے۔ حالانکہ اگر وہ ایسا کر سکتے تو نہایت آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ یہ راہ بہت آسان تھی کہ قرآن کے مخالفین قرآن کی کسی ایک سورہ جیسی سورہ بنا کر دنیا کے سامنے رکھ دیتے اور ان کا یہ دعویٰ ثابت ہو جاتا کہ اسلام دینِ حق نہیں اور قرآن کلام الٰہی نہیں ہے بلکہ انسانی دماغ کی بناوٹ ہے۔ پھر مخالفین

کو نہ اس کی ضرورت پیش آتی کہ وہ رسولؐ اور رسولؐ کے صحابہؓ کو ایذا رسانیوں میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں نہ ان مخالفین کو اسلام اور رسولؐ کے خلاف سازشوں اور معاندانہ پروپیگنڈوں اور غوغا آرائیوں کی ضرورت تھی۔ نہ انہیں باہر سے مدد حاصل کرنے کی زحمت کرنی پڑتی اور نہ رسولؐ اور رسولؐ کے صحابہؓ کے خلاف انہیں تلوار اٹھانے کی ضرورت پڑتی۔ کیونکہ ایک آسان راہ کو چھوڑ کر خواہ مخواہ دشواریوں اور مشکلات میں اپنے آپ کو ڈالنے کی زحمت کون گوارا کرتا ہے۔ جو مقصد جنگ کئے بغیر حاصل ہو جائے اس کیلئے زخمی اور قتل ہونے کے لئے میدانِ جنگ کا رخ کون کرتا ہے۔ مخالفت میں اپنی اولاد کو یتیم اور اپنی بیویوں کو بیوہ کرنے کی حد تک جانے کے لئے بلا ضرورت شدید بآسانی اور بخوشی کون آمادہ ہوتا ہے لیکن اعدائے دین نے اسلام کو ملیامیٹ کرنے کیلئے ہر طرح کے جتن کئے ہر قسم کی تدبیریں کیں اور ہر ایسا اقدام کیا جس میں خود انہیں صاف طور پر اپنے جانی و مالی نقصانات نظر آ رہے تھے مگر قرآن کی کسی ایک سورہ جیسی سورہ بنا کر پیش نہ کر سکے۔

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن ایک معجزہ ہے کیونکہ معجزہ کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو نبی کی تصدیق کے لئے نبی کے ذریعہ من جانب اللہ صادر ہو اور چیلنج دیئے جانے کے باوجود قرآن کے منکرین قرآن کی کسی سورۃ جیسی سورہ بنا کر پیش نہ کر سکے تو قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے میں ریب و شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور قرآن کی وہ لاریبیت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے جس کا اعلان سورۂ بقرہ کی بالکل ابتداہی میں اس طرح کیا گیا ہے کہ لاریب فیہ۔ یعنی اس کتاب کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعدائے دین جو "ساحر" کہا کرتے وہ اسی بنا پر کہ یہ قرآن اپنی تاثیر کے لحاظ سے انہیں سحر جیسا نظر آتا تھا اور چونکہ وہ ایسا کلام پیش کرنے سے قاصر تھے اس لئے انہیں کرنی نہ کوئی بات تو بنانی ہی تھی چنانچہ بطور "عذر گناہ" انہوں نے اسے "سحر" کہہ دیا حالانکہ وہ خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ اسلام دینِ حق ہے اور قرآن کی لانے والی شخصیت کسی طرح کے جسمانی واخلاقی یا ذہنی و عقلی مرض کی شکار نہیں ہے (یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم) لیکن چونکہ معجزہ اور سحر میں ظاہری آنکھوں کو کوئی فرق نظر نہیں آتا اس لئے معاندینِ حق نے رسولؐ کو ساحر کہہ کر قرآن کی کسی سورہ جیسی سورہ پیش کرنے سے اپنے عاجز و قاصر رہنے پر پردہ ڈالنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کی کیونکہ معجزہ اور سحر میں فرق ہے اور بہت بڑا فرق ہے مثلاً یہ

کہ معجزہ کے ذریعے تحدی کی جاتی ہے اور وہ نبوت کے دعویٰ کا ثبوت ہوتا ہے۔ بخلاف سحر کے کہ اس میں چیلنج نہیں ہوتا۔ دوسرا ایک بہت بڑا اور واضح فرق معجزہ اور سحر میں یہ ہے کہ سحر ایک باضابطہ فن ہے جس کے کچھ مقررہ اصول و قواعد ہیں۔ دوسرے علوم کی طرح وہ سیکھا اور سکھایا جاتا ہے مشق سے اس میں مہارت حاصل کی جاتی ہے۔ ساحر جب چاہے اپنے فن کا مظاہرہ کر سکتا ہے بخلاف معجزہ کے کہ یہ کوئی فن نہیں ہے اور اس کے کوئی مقررہ اصول و قواعد نہیں۔ علم کی طرح یہ سیکھا سکھایا نہیں جاتا۔ مشق اور مہارت کا اس میں کوئی سوال نہیں اور نبی سے وہ اسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب حکم الٰہی ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی معجزہ اور سحر کے درمیان مختلف اور متعدد قسم کے فرق ہیں جنہیں بسط و تفصیل سے علامہ ابن حزم نے "الفصل بین الملل والنحل" میں اور امام رازی نے اپنی تفسیر میں بیان کئے ہیں۔

رہی یہ بات کہ وجوہِ اعجاز القرآن کیا ہیں تو اس سلسلے میں مختلف علماء اور مفکرین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مختلف وجوہ بیان کی ہیں جو مختصراً یہ ہیں:

* جمہور معتزلہ کا مسلک یہ ہے کہ فصحائے عرب کی نثر کے جتنے اسالیب تھے قرآن حکیم کا اسلوب ان سب سے جداگانہ ایک ایسی نوعیت رکھتا ہے جس کا مثل لانا انسان کے بس کی بات نہیں، لہٰذا قرآن مجید اپنے نظم کلام اور اسلوب کے لحاظ سے معجزہ ہے قاضی ابوبکر کا بھی یہی قول ہے۔
* اشاعرہ کہتے ہیں کہ فصاحت و بلاغت کی معراج سے بہرہ مند بڑے سے بڑا فصیح و بلیغ بھی قرآن جیسا فصیح و بلیغ کلام بول نہیں سکتا۔ اس بناء پر قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے۔
* بعض متکلمین کے خیال میں قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ علوم و فنون کا بحرِ بیکراں اپنے اندر رکھنے والا یہ کلام نبی امی کی زبان سے ادا ہوا۔
* بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ قرآن اسلئے معجزہ ہے کہ اُس نے ماضی کی ایسی سچی خبریں دیں جن کی تردید وقت کے بڑے سے بڑے ایسے علم و کتاب تک سے نہ ہو سکی جو اس بات کے درپے رہا کرتے کہ انہیں قرآن کی کسی غلطی کی گرفت کا موقع ملے اور بعض آئندہ واقعات کے بارے میں جو پیشن گوئیاں قرآن نے کیں وہ سب حرف بہ حرف پوری ہوئیں۔

* کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ قرآن اس لئے معجزہ ہے کہ وہ اپنے اندر ایسی حیرت انگیز تاثیر رکھتا ہے جس سے عربی کا ذوق نہ رکھنے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے. علامہ سیوطی کی نظر میں بھی منجملہ دیگر وجوہ اعجازِ قرآن کے ایک وجہ یہ بھی ہے۔
* چند حضرات قرآن کا اعجاز یہ قرار دیتے ہیں کہ وہ ان بھیدوں کو ظاہر کر دیتا تھا جن کو لوگ اپنے دلوں میں چھپائے بیٹھے رہتے اور جن پر اطلاع کسی انسان کی نہیں ہو سکتی تھی آگے بڑھنے سے پہلے عیسیٰ بن صبیح (م ۲۲۶ھ) اور نظام معتزلی (م مابین ۲۲۰ھ و ۲۳۰ھ) کا تذکرہ کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پوری امت مسلمہ میں غالباً یہ دو اشخاص ایسے ہیں جو فصاحت و بلاغت یا اسلوب بیان کے لحاظ سے قرآن کو معجزہ نہیں قرار دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس جیسا فصیح و بلیغ اور اس جیسے طرز بیان کا حامل کلام کوئی دوسرا بھی پیش کر سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے قدرت و استعداد سلب کر لی تھی اس لئے کوئی اس چیلنج کا جواب باصواب نہ دے سکا لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان حضرات کا یہ کہنا بھی بجائے خود ایک معجزۂ قرآن ہے۔ ؎

ترے جلوؤں کے آگے ہمتِ شرح و بیاں رکھ دی
زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زباں رکھ دی

خیر یہ تو ایک ضمنی سی بات تھی۔ اب پھر اصل موضوع سے متعلق ہمیں یہ کہنا ہے کہ اس باب میں شاہ ولی اللہؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن کا فصاحت و بلاغت یا اسلوب ادا یا کسی اور حیثیت سے معجزہ ہونا ایک امر واقعہ ہونے کے باوجود عرب اور اہل زبان یا زمانۂ نزول قرآن سے خاص ہوگا لیکن قرآن تو ہر زمانے میں اور ساری انسانی دنیا کے لئے معجزہ ہے اس لئے وہ وجوہ اعجاز قرآن کے سلسلے میں یہ فرماتے ہیں کہ قرآن اس لحاظ سے معجزہ ہے کہ وہ ہر دور کے لئے اور ہر خطۂ ارضی کے رہنے والے انسانوں کے لئے ان کی زندگی کے ہر شعبہ کا ایک ایسا مکمل اور بے نظیر دستور پیش کرتا ہے جس کا بنانا زمان و مکان کی حدود میں مقید ایسے مادی انسانوں کے لئے ناممکن ہے جو طرح طرح کے میلانات و رجحانات میں جکڑے ہوئے بھی ہوتے ہیں اور جن کی عقلیں بھی ناقص ہیں اور جو مستقبل کے پردے کے پیچھے دیکھ بھی نہیں سکتے۔ قیامت تک کے انسانوں کے لئے جامع، مکمل اور فوز و فلاح سے معمور دستور حیات وہی ہستی دے سکتی ہے جو جسمانی اور مادی خاندانی اور گروہی

۲۰۹۹

قوی اور جسمانی وغیرہ عوالم و امیال سے منزہ اور زمان و مکان سے ماوراء ہو اور جس کا علم ازل سے ابد تک کو محیط اور بے کراں ہو۔

وجوہ اعجاز قرآن کے سلسلے میں صاحب "مناہل العرفان فی علوم القرآن" کے وہ افادات بھی اپنے اندر بڑی بصیرت اور افادیت رکھتے ہیں جو قرآن کے تدریجی نزول کی حکمتوں سے متعلق ہیں خصوصیت سے چوتھی حکمت کے تحت انہوں نے جو اس طرح بیان کیا ہے کہ:۔

"آپ قرآن حکیم کو اول سے آخر تک پڑھ جائیے۔ اس کی عبارت میں جھول نہیں، طرز بیان میں انتہائی جاذبیت اور استحکام ہے اس کے الف سے ی تک ہر ہر جملہ میں اعجاز کی روح جاری و ساری ہے اس کی سورتیں اور آیات آپس میں اس مضبوطی سے جڑی ہوئی ہیں جیسے کسی ہار میں جڑے ہوئے نگینے کہ ہر نگینہ دوسرے سے اس طرح پیوست ہوتا ہے کہ ان میں نہ علیحدگی محسوس ہوتی ہے اور نہ اجنبیت۔ گویا موتیوں کی ایک نہایت دیدہ زیب لڑی ہے، جس میں حروف و کلمات اور جملوں کے موتی منظم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت مرتب اور ایک دوسرے سے بغایت پیوست ہیں۔ اس میں نتیجہ کلام مبدا کلام کے ساتھ اس طرح مربوط ہے کہ گویا یہ اس کے لئے غایت و مطلوب ہو اور اول سے آخر تک یہ ساری کیفیات یکساں پائی جاتی ہیں۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن میں کلام کی یہ کامل معجزانہ ترتیب کیسے پیدا ہوئی اور اسے یہ حیران کن مربوط انداز بیان کیسے حاصل ہوا۔ حالانکہ وہ یکجا اور یکبارگی نازل نہیں ہوا بلکہ متفرق اوقات میں پیش آمدہ مختلف اوقات میں واقعات کے سلسلے میں بیس سال سے زیادہ عرصہ میں نازل ہوا ہے۔

اس کا جواب بس یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اس سے اعجاز قرآنی کے ایک نئے راز کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور ایک ایسی دلیل ہمارے سامنے آتی ہے جو روز روشن کی طرح بتاتی ہے کہ یہ قرآن بلا شائبہ ریب کلام الٰہی ہے ورنہ کوئی ایمانداری سے بتلائے کہ آخر کسی مخلوق کو اس بات کی استطاعت کیسے حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ ایسی کتاب پیش کرے جس کے مختلف حصے مختلف عوامل کے داعیات ہوں اور متفرق زمانوں کے واقعات اور مختلف پیش آمدہ حالات و مسائل اس کتاب کے اجزاء کیلئے بمنزلۂ اسباب ہوں۔ اور ان تمام امور کے باوجود انداز بیان کا حال یہ ہو کہ جس

معلّم کو دیکھیے دل کشی اور تاثیر کے لحاظ سے "جا ایں جا است" کا مصداق ہے اور فصاحت و بلاغت کی کیفیت یہ ہو کہ اول سے آخر تک جیسے یکساں اور انمول نگینے سجے ہوئے ہیں اور ربط و انفعال اور نظم و ترتیب کا عالم یہ ہو کہ ابتدا سے لے کر انتہا تک نہایت مضبوطی سے ہر جزو ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہو۔

وہ عوامل اور زمانے کے وہ واقعات جن کی حیثیت اسباب نزول کی ہے کیا کسی بشر کی قدرت میں ہیں؟ یعنی کیا کوئی انسانی فرد زمانے پر اس طرح کا قابو رکھتا ہے یا رکھ سکتا ہے کہ وہ لامحالہ واقعات و عوامل ایسے رونما کرائے اور زندگی کے ایسے ہی مسائل ابھارے جن کے متعلق اسے کوئی حکم دینا اور رہنمائی مقصود ہو اور بیس سال سے زیادہ مدت تک اس طرح کرتا چلا جائے۔

ایک طرف زمانے کا فصل ہے اور دوسری طرف وہ اختلاف ہے جو ان داعیان کے درمیان ملحوظ ہے اس کا فطرتاً یہ نتیجہ نکلنا چاہیے تھا کہ جا بجا خلا اور رخنہ ہو اور اسباب کے ماتحت تدریج کی بنا پر ربط و اتصال کا کوئی موقع باقی نہ رہے لیکن قرآن حکیم نے اس گوشے میں بھی خرقِ عادت اور اعجاز سے کام لیا ہے کہ وہ تدریجاً نازل ہوا۔ لیکن اس کے باوجود مربوط اور محکم رہا اس کی تدریج اگرچہ نزول کے مختلف اسباب و مواقع کے لحاظ سے متفرق رہی لیکن اس کا نظم اس طرح برقرار رہا جیسے دوستوں کی جماعت متفرق اوقات میں کہیں مجتمع ہو کر ان کے اس اجتماع میں اوقات علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور زمانوں کا فرق ہوتا ہے مگر رفاقت اور تعلق اور یگانگت کے لحاظ سے ان کے وصل میں زمانے کا یہ فصل و بُعد رخنہ نہیں ڈال سکتا۔ اسی طرح نزول قرآن کا معاملہ ہے کہ بیس سال سے زائد عرصہ تک متفرق اوقات اور مختلف زمانوں میں اس کی آیات و سورہ نازل ہوتی رہیں تاآنکہ اس طویل مدت کے بعد سب کا اجتماع ہو گیا اور پھر جو صورتحال سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اوقات اور زمانوں کے اختلافات اور عوامل و دواعی کی جداگانہ نوعیتوں کے باوجود اس کا ہر جملہ دوسرے جملے سے مربوط ہے ہر آیت دوسری آیت سے متعلق ہے اور ہر سورہ دوسری سورہ سے ایک گہرا تعلق رکھتی ہے۔

کیا یہ صورتحال اس بات کی روشن دلیل نہیں کہ قرآن حکیم کلام ہے اس ہستی کا جو خالقِ عالم ہے قوی و قدیر ہے مالک اسباب و مسببات ہے مدبر کائنات ہے علیم ہے اور اس کا علم ازل سے ابد تک محیط ہے زمانے کا کوئی جزو اس سے پوشیدہ نہیں اور ابد تک ابھرنے

والے حالات و واقعات کو خبر رکھتی ہے۔" (مناہل العرفان فی علوم القرآن ج ۱)

کہنے کو تو اعجاز قرآن کی یہ مختلف وجوہات ہیں لیکن ایکدوسرے کی ضد نہیں۔ بلکہ حقیقت میں ان ساری حیثیتوں سے قرآن معجزہ ہے لیکن مختلف علم وفن کے ماہر والوں نے اپنے اپنے مخصوص علم وفن کے زاویۂ نگاہ سے نظر ڈالی ہے اس لئے ہر ایک نے وہی وجہ بیان کی جو اس کے فن کے آئینہ میں جھلکتی نظر آئی۔

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن

لیکن اپنا اپنا دامن

اب اخیر میں قرآن مجید کی لاریبیت کے ایک اس رخ پر بھی نظر ڈال لینی مناسب ہے کہ چونکہ لاریبیت کا ایک بہت بڑا اور گہرا تعلق تواتر کے ساتھ ہے۔ اس بنا پر جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ قرآن کی شانِ لاریبیت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس شانِ لاریبیت کا دائرہ پھیلتا ہی چلا جائے گا، اور یہ تواتر ہمہ جہتی ہے، یعنی :-

۱- تواتر مکانی — یعنی کسی ایک جگہ کے ساتھ چیز کا متواتر ہونا مخصوص نہ ہو۔ قرآن میں یہی بات ہے کہ وہ صرف مکہ اور مدینہ یا عرب ہی میں متواتر نہ رہا بلکہ دنیا کے ہر گوشے میں متواتر رہا اور متواتر ہے۔

۲- تواتر زمانی — یعنی کسی خاص زمانے میں چیز کا تواتر نہ ہو بلکہ ہر زمانے میں وہ متواتر ہو۔ قرآن میں یہ بات بھی ہے یعنی قرآن عہدِ رسالت یا عہدِ صحابہ یا کسی اور خاص زمانے ہی میں متواتر نہیں بلکہ زمانے کے ہر دور میں متواتر رہا اور متواتر ہے

۳- تواتر منسوب الیہ — یعنی جس کی طرف چیز کی نسبت ہے، وہ بھی متواتر ہو اور اس لحاظ سے بھی وہ چیز متواتر ہو۔ یہ صورت بھی قرآن میں ہے یعنی جس ذات رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف اس کی نسبت ہے اور جنہوں نے خدا کے کلام کی حیثیت سے اس کلام کو پیش کیا۔ وہ اپنی ذات مقدسہ سے بھی متواتر ہے اور اس ذات مقدسہ

کا تواتر بھی کسی مکان اور کسی زمانے سے خاص نہیں۔ اپنی ولادت سے لے کر آج تک زمانے کے ہر دور میں اور دنیا کے ہر خطہ میں ذات رسالت مآب صلعم سورج کی طرح روشن رہی ہے اور روشن رہے گی۔ اس طرح اس زاویہ سے بھی قرآن متواتر ہے۔

۴۔ تواتر منسوب ــ یعنی جو چیز کسی کی طرف منسوب ہو، وہ چیز متواتر ہو، یہ بات بھی قرآن میں ہے یعنی قرآن کا رسول ؐ کی طرف منسوب ہونا بھی متواتر ہے۔

۵۔ تواتر نسبت ــ یعنی منسوب اور منسوب الیہ کے درمیان کا تعلق اور علاقہ متواتر ہو اس لحاظ سے بھی قرآن متواتر ہے یعنی موافق وحامی ہوں یا مخالف و معاند، اقرار کرنیوالے ہوں یا انکار کرنے والے، سبھی نے یہ کہا اور سب یہی کہتے چلے آرہے ہیں کہ اس قرآن کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنا کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام کہہ کر پیش کیا۔

۶۔ تواتر جزو کل ــ یعنی کوئی چیز اپنی مجموعی شکل ہی میں متواتر نہ ہو بلکہ اس کا ہر ہر جزو بھی متواتر ہو اس حیثیت سے بھی قرآن متواتر ہے یعنی جس طرح یہ قرآن مجموعی حیثیت سے متواتر ہے اسی طرح اس کا ایک ایک جملہ ایک ایک لفظ، ایک ایک حرکت ایک ایک نقطہ اور ایک ایک شوشہ متواتر ہے۔

پھر قرآن کی ایک ایک تعلیم ایک ایک ہدایت کو دیکھا جائے تو اس باب میں بھی عجیب و غریب تواتر کی شان نظر آتی ہے مثلاً تواتر تلاوت، تواتر حفظ، تواتر کتابت تواتر عمل و مذاکرہ اور تواتر فکر و تدبر وغیرہ کہ ہر تعلیم وہدایت کے نزول کے وقت سے ان کا جو غلغلہ بلند ہوا ہے۔ تو جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ ہر تعلیم وہدایت کی بابت تواتر کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

لاریبیت کی یہ شان کہ ان ساری حیثیتوں سے اور اپنی ایک ایک تعلیم کی جہت اور ایک ایک ہدایت کے زاویہ سے کوئی کتاب متواتر ہو، صرف قرآن کو حاصل ہے آج تک دنیا میں

اس آسمان کے نیچے ان تمام حیثیتوں اور ان تمام جہات سے کوئی کتاب نہ متواتر ہوئی ہے۔ نہ متواتر ہوگی۔

پس جس طرح اللہ تعالیٰ لاشریک لہٗ ہے۔ اسی طرح ان کا یہ کلام اپنی فصاحت و بلاغت میں، اپنے نظم و ترتیب اور اسلوب ادا میں، اپنے طرز خطاب میں، اپنے طرز استدلال میں اور اپنی تعلیمات و ہدایات کے ابدی ہونے اور تواتر کی ہر نوعیت کو اپنے دامن میں رکھنے اور ہر ہر تعلیم و ہدایت کی عملی جہت کے لحاظ سے من کل الوجوہ متواتر ہونے میں لاشریک لہٗ ہے۔

اس کے باوجود اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ کتاب "محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تصنیف" ہے تو عجب نہیں کہ وہ کل یہ کہنے لگے کہ آفتاب برف کی سِل ہے جو فلاں آئس فیکٹری (ICE-Fectory) میں تیار ہوئی تھی۔

ہاروت وماروت

ہاروت اور ماروت کا قصہ بھی بنی اسرائیل کے فردِ جرم کی ایک کڑی ہے اس سلسلہ میں آیا یہ دو شخصیتیں انسان تھے۔ انسان تھا فرشتہ یا جنات ؟ فرقہ معتزلہ کے نزدیک اس آیت میں شیاطین سے مراد وہ سرکش وخبیث انسان ہیں جو حضرت سلیمان کے خلاف بغاوت میں شریک تھے اور آپ پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے اور یہ لوگ سحر و کہانت کے ماہر تھے جب کہ مفسرین اہلسنت کے ہاں جن و انس دونوں معنی کی گنجائش موجود ہے۔

ہاروت و ماروت کے بیان سے قبل اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کی اس ہٹ دھرمی کو بیان فرماتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ بنی اسرائیل اللہ کے حکم کی پابندی اور اپنے پیغمبر کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ایک ایسے علم کو اختیار کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ جس کا سیکھنا گویا شیطان کی تابعداری ہے۔ اس حقیقت کو سورۂ بقرہ کی آیت اس طرح واضح کرتی ہے۔

" وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ۔

دراصل سحر و کہانت میں یہودیوں کی مہارت "تاریخ میں تسلیم کی گئی ہے" یہودی اکابرین نہ صرف اس کا اعتراف کرتے ہیں بلکہ بڑے فخر کے ساتھ اس میں مہارت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ یہود کا یہ شوق ان کی قدیم تاریخ کے علاوہ حضور اکرمؐ کے زمانے میں بھی قائم تھا۔ مشہور یہودی پروفیسر مارکولیس جو کہ اسلام دشمنی میں اپنی مثال آپ ہے لکھتا ہے کہ "یہ لوگ فنِ سحر کے ماہر تھے اور بجائے میدان جنگ میں آنے کے سفلی عملیات کو ترجیح دیتے تھے۔

حضرت سلیمان کے زمانے کے یہودی اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ جادو ٹونے تو خود کرتے لیکن ان کی نسبت حضرت سلیمان کی طرف کر دیتے لیکن اللہ تبارک نے ان کی ریشہ دوانیوں کو قرآن کے ان الفاظ میں بیان کرتے ہوئے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بری الذمہ قرار دیا ہے۔

"وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا"

یہاں ان کو کفر کا لقب ہی اس لئے دیا گیا کہ یہ لوگ جادو سیکھنے اور سکھانے کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ۔

صرف اسی پر اتفاق نہیں کیا جاتا بلکہ شرک جیسے گناہِ عظیم کی لعنت بھی وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیتے تھے جیسا کہ خود یہودی کتاب عہد نامہ عتیق میں موجود ہے

■ جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی بیویوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا"

یہودی جب بابل واپس آئے تو وہاں پر ہاروت و ماروت سے علم سحر سیکھنے لگے جیسا کہ قرآن کی یہ آیت بیان کرتی ہے۔

"وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ"

ہاروت و ماروت دراصل ان دو فرشتوں کے نام ہیں جو اگرچہ اپنی اصل حقیقت کے لحاظ سے فرشتے تھے لیکن جب ایک خاص وجہ سے وہ انسانوں کے اندر رہنے لگے تو ظاہر ہے کہ ان کی شکل و شباہت، رنگ روپ، جسم و قالب انسانوں ہی جیسا ہو گیا ہوگا۔ اور ان کی عادتیں اور جذبات بھی بالکل انسانوں جیسے ہوں گے۔

مگر بعض مفسرین نے اس جگہ یہود کا ایک اور قصہ بھی بیان کیا ہے جس کا تعلق عراق کی مشہور رقاصہ زہرہ سے ہے۔ لیکن قاضی عیاض، امام رازی اور شہاب الدین عراقی جیسے مفسرین نے اس کی صحت سے انکار کیا ہے۔

جو لوگ سحر سے دلچسپی رکھتے تھے اور فسق و فجور بحیثیت پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے جب ہاروت و ماروت کے پاس آتے تو پوچھتے کہ یہ سحر کیا چیز ہے جس سے آپ ہمیں منع کرتے ہیں اور جب فرشتے کہتے کہ دیکھو سحر سے یہ نقصان ہوتا ہے اس کی حقیقت یہ ہے اور اس پر عمل کرنا کفر کا کام ہے تو یہ لوگ واپس لوٹنے کے بعد بجائے اس کے کہ سحر سے بچتے الٹا اس پر عمل شروع کر دیتے حالانکہ فرشتے انھیں صاف صاف بتا دیتے کہ یہ کفر کا کام ہے جیسا کہ خود سورہ بقرہ میں ارشاد خداوندی ہے

وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ۔

حالانکہ ان کاموں سے یہ لوگ بغیر اس کے اور کچھ نہ کرسکتے تھے کہ صرف مرد و عورت میں جدائی ڈال دیں جس پر سورۂ بقرۃ اس طرح روشنی ڈالتی ہے۔

"مَا يُفَرِّقُونَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ"۔

یہ تو قرآن کی روشنی میں ان کے سحر کی حقیقت تھی جب کہ خود یہودی ادب میں "جیوش انسائیکلوپیڈیا" بھی اس حقیقت کو کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ "سحر کی سب سے زیادہ عام صورت اس نقش کی تھی جو ناجائز تعلقات قائم کرنے کے لئے دیا جاتا تھا اور اس قسم کے سحر کی ماہرہ زیادہ تر عورتیں ہوتی تھیں"

اس بیان کے بعد خداوند کریم فرماتے ہیں کہ جہاں تک تمھارے اس سحر سے نقصان پہنچانے کا سوال ہے وہ تو خود میرے ہاتھ میں ہے۔ تم تو وہ چیزیں سیکھتے ہو جو تمھیں نفع پہنچانے کے بجائے نقصان دینے والی ہیں جیسا کہ خود سورۂ بقرۃ کی اس آیت سے ظاہر ہے۔

"وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ"

اور اس حقیقت حال سے یہ خود بھی باخبر ہیں کہ ان کاموں کی بنا پر یہ لوگ اپنی آخرت خراب کر رہے ہیں مگر اس کے باوجود شیطانی کام چھوڑنے پر تیار نہیں تو کاش کہ یہ جان لیتے کہ آخرت میں ان کے لئے کچھ بھی حصہ نہیں کیونکہ نہ تو انھوں نے اپنے پیغمبر کی بات مانی اور نہ ہی عقل سلیم سے غور کیا۔ یعنی:-

"وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ"

طالوت اور جالوت

طالوت اور جالوت کا قصہ دراصل موسیٰ علیہ السلام کے تین سو سال بعد بنی اسرائیل ہی کی ایک داستان ہے، موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے ایک نبی شموئیل تھے۔ اس وقت اسرائیل اپنے دشمنوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ حضرت شموئیل بوڑھے ہو چکے تھے اور بقول توریت ان کے بیٹوں میں رہنمائی کی صلاحیت نہ تھی چنانچہ اسرائیلیوں نے حضرت شموئیل سے درخواست کی کہ ہمارے لئے ایک امیر مقرر فرما دیجئے جس کی سرکردگی میں ہم اپنے دشمنوں سے لڑ کر ان کا خاتمہ کرسکیں جیسا کہ سورۃ بقرۃ کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

" قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا"

اس آیت میں بنی اسرائیل سے یہ کہا گیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اگر تم پر جنگ فرض کردی گئی تو تم جنگ نہ کرو گے۔ اس طرح یہ بیان کیا گیا کہ اس قوم کی سرکشی سے اللہ تعالیٰ پوری طرح باخبر ہے۔ اسرائیلیوں نے پختہ عہد کیا کہ ہم ضرور اللہ کی راہ میں لڑیں گے چنانچہ حضرت شموئیل نے اللہ کے حکم سے طالوت نامی ایک شخص کو ان پر امیر مقرر کیا۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ط

یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو حکم دینے والا بنایا۔ مگر یہ بدبخت قوم جس کا شیوہ ہی سرکشی اور بال کی کھال نکالنا تھا۔ پکار اٹھی کہ آپ ہم پر ایک ایسے شخص کو امیر مقرر کرتے ہیں کہ جو مالی اعتبار سے بھی ہمارے برابر نہیں اور ہم اس سے زیادہ امیر ہیں " وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ " تو خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ یہ طالوت کا انتخاب مصلحت خداوندی ہے جس کو سمجھنا تمہارے بس کا کام نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ملک عنایت کرتا ہے۔

وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ط

خدا کی طرف سے دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ تم ذرا عقل سے سوچو تو کہ جنگ کے

دوران ذمہ داری اسی کو سونپی جاتی ہے جو فن سپہ گری کا ماہر ہو۔ اور جسمانی لحاظ سے امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ طالوت کی ان خصوصیات کو نہ صرف قرآن نے بیان کیا ہے بلکہ توریت نے بھی اس کی گواہی دی ہے۔ قرآن کہتا ہے :۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ

خود توریت طالوت کی صفات اس طرح بیان کرتی ہے کہ :۔

"بہت خوب جوان تھا اور بنی اسرائیل کے درمیان اس سے خوبصورت کوئی بھی شخص نہ تھا۔ یہ ساری قوم میں کاندھوں سے لے کر اوپر تک ہر ایک سے اونچا تھا"

قرآن کا طرز بیان دیکھئے کہ ان کی صفات خود ان کے نام سے بھی ظاہر ہے جیساکہ اہل تحقیق کا کہنا ہے کہ طالوت دراصل طولوت تھا جو کہ طول سے بنا ہے۔

اسرائیل کی مزید تشفی کے لئے یہ کہا کہ اس کے امیر بنائے جانے کی نشانی یہ ہے کہ وہ صندوق جسے تم بہت متبرک سمجھتے تھے اور جو فلسطینی تم سے چھین کر لے گئے تھے وہ صندوق خود بخود تمھارے پاس پہنچ جائے گا۔ جس کو قرآن کی سورۃ بقرۃ اس طرح بیان کرتی ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

یعنی ان کے نبی نے کہا کہ اس کے امیر بنائے جانے کی نشانی یہ ہے کہ وہ صندوق جس میں تمھارے لئے تمھارے رب کی طرف سے تسکین ہے، خود بخود تمھارے پاس آجائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

جب انھوں نے بوجہ مجبوری طالوت کو اپنا امیر مان ہی لیا تو طالوت اپنی فوج کو لیکر جو کہ ۸۰۰۰۰ کے قریب تھی دشمن کی طرف روانہ ہوا تو راستہ میں دریائے اردن تھا۔ آپ نے تمام فوجیوں سے فرمایا کہ کوئی بھی اس سے پانی نہ پیئے بجز چلو بھر کے اگر ہاتھ میں لے لے جیسا کہ سورۃ بقرۃ میں ارشاد ہے۔ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّىْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ

جو کوئی اس میں سے پانی پیئے گا وہ میرا نہیں اور جو اسے نہ چکھے وہی میرا ہے مگر ایک چلو بھر ہاتھ سے لینے میں مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ نافرمان قوم کب صبر کرنے والی تھی۔ چند لوگوں کے علاوہ سب نے خوب جی بھر کر پانی پیا۔ فشربوا منه الا قليلا منهم ؕ

اس نافرمانی کا اثر یہ ہوا کہ جن لوگوں نے امیر کی نافرمانی کرتے ہوئے پانی پیا ان کے لئے چلنا تک دشوار ہوگیا تھا۔ اور وہ اپنے دشمن کی فوج جس کا سردار جالوت تھا کو دیکھکر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کہ ہم تو تھوڑے سے ہیں کون اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کرے گا۔ اور میدان میں اترنے پر پس و پیش کرنے لگے مگر جو لوگ سچے دل سے مسلمان تھے وہ ہرگز نہ تو مرعوب ہوئے اور نہ دہشت زدہ بلکہ انھوں نے کہا کہ :۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ

"یعنی اللہ کے حکم سے کئی مرتبہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں"

جالوت جو کہ فلسطینی فوج کا سردار تھا اس کی تعریف میں خود توریت اس طرح رطب اللسان ہے کہ :۔ "وہ گویا انسانوں میں نہیں بلکہ دیوتا تھا! اس کا قد دس فٹ تھا۔ اور اسی طرح سے بے پناہ قوت کا مالک تھا۔ چہرے کے علاوہ سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق رہتا۔ اس کی طاقت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف اس کی سپر کا وزن تین من تھا!"

جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو اسرائیلوں نے دشمن کی تعداد اور ان کے ساز و سامان کو دیکھا تو کئی متزلزل ہو گئے لیکن ان میں جو واقعی خدا کی راہ میں لڑنے کے لئے نکلے تھے۔ انھوں نے فوراً پروردگار کو یاد کیا اور درخواست کی کہ اے اللہ! ہم پر صبر نازل فرما اور ہمیں دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے کی توفیق بخش اور ہمیں کافروں کی قوم پر فتح عنایت فرما۔ قرآن کریم کی سورۂ بقرۃ میں اس دعا کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ جب بھی مسلمان پر کوئی ایسا وقت آن پڑے کو وہ دنیاوی ساز و سامان کی پرواہ کئے بغیر اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:

"رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ"

چنانچہ جب گھمسان کی جنگ ہوئی اور جالوت طالوتی فوج کی صفوں کی طرف بپھرتا ہوا دوڑا تو حضرت داؤد جو اس وقت طالوتی فوج میں صرف بحیثیت ایک سپاہی تھے۔ انھوں نے بڑی پھرتی سے کام لیا اور اپنے تھیلے میں سے ایک پتھر نکال کر جالوت کو ایسا مارا کہ وہ واصل جہنم ہوگیا۔ خود توریت میں جالوت کی ہلاکت کا ذکر کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

" جب جالوت آگے بڑھا اور طالوتی صفوں کی طرف داؤد سے مقابلہ کے لئے دوڑا

تو داؤد نے پھرتی کی اور اپنے تھیلے میں سے پتھر نکال کر ایسا مارا کہ اس کے ماتھے میں پیوست ہوگیا اور جالوت منہ کے بل گر پڑا۔

قرآن کی سورۃ بقرۃ جالوت کی ہلاکت کی گواہی اس طرح بیان کرتی ہے۔

"وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ"

جب فلسطینیوں نے دیکھا کہ ان کا سردار مارا گیا تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اسرائیلیوں نے ان کا پیچھا کیا اور انھیں بری طرح شکست فاش دی اس کے بعد قرآن بیان کرتا ہے کہ ہم نے داؤد کو نبوت بھی بخشی اور ایک وسیع سلطنت کا مالک بنایا حضرت داؤد طالوت کے داماد تھے اسرائیلیوں کے ایک قبیلہ یہودہ نے طالوت کے وفات کے بعد داؤد کو اپنا بادشاہ منتخب کیا اور دو سال کی کشمکش کے بعد باقی قبیلوں نے بھی آپ کی قیادت پر اتفاق کر لیا۔

سات سال تک آپ نے جبرون کو دارالخلافہ رکھا اور پھر جب یروشلم فتح ہوگیا تو وہ دارالسلطنت بنا۔ آپ کا عہد حکومت تاریخ اسرائیل میں فتوحات ملک اور حسن انتظام دونوں کے لئے یادگار ہے جس کو قرآن نے بھی بیان کیا ہے کہ خدا نے حضرت داؤد کو حکمت یعنی نبوت اور بادشاہت عطا کی چنانچہ سورۃ بقرۃ میں ارشاد خداوندی ہے۔

وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ

الغرض طالوت و جالوت کا بیان بھی حق و باطل کا ایک معرکہ ہونے کے ساتھ ساتھ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جس سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہیئے اور خدا کی زمین میں آرام و سکون کے لئے کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ اگر ہم زمین میں فساد برپا کریں گے تو خدا کا قانون ہے کہ وہ ضرور ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اس کے حکم سے اس فساد کو دفع کریں گے اور جالوت کے اسی بیان کے آخر میں اللہ تبارک و تعالیٰ سورۃ بقرۃ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ،

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔

یعنی اللہ تم میں سے بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرتا تو زمین پر فساد برپا ہوتا۔

اور خدا کا یہ قانون جہاں والوں کے لئے ایک خاص فضل عنایت ہے جس کے لئے ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ؕ

صیام

صیام لفظ صوم سے نکلا ہے۔ جس کے اصطلاحی معنی روزہ رکھنے کے ہیں۔ قرآن پاک کی سورۃ بقرہ میں صیام کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ جس کی روشنی میں ذیل میں صیام پر نوٹ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ **روزہ کی فرضیت**:۔ روزہ دوسری عبادت کی طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے۔ جس کا حکم اس طرح ہے۔

"یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ"

۲۔ **روزہ اور اگلی شریعتیں**:۔ روزہ نہ صرف حضور اکرمؐ کی اُمت پر فرض کیا گیا ہے۔ بلکہ ان سے پہلے کی اُمتوں پر بھی فرض تھا۔ مثال کے طور پر یہودی تاریخ میں بھی واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کہ یہودی روزہ رکھنے کے عادی تھے۔" جس کا انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا" میں بھی کچھ اس طرح ذکر موجود ہے۔

"یہودی مذہب کے پیروا اکثر روزہ سے اپنی یہودیت کا اظہار کرتے تھے

قرآن میں پہلے کی اُمتوں پر فرضیت کا انکشاف کچھ اس طرح واضح ہے"۔

"کما کتب علی الذین من قبلکم"

۳۔ **روزے کا مقصد**: روزہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے فرض نہیں کیا کہ ہم اپنے جسم کو بھوک اور پیاس سے سکھائے رکھیں۔ جیسا کہ ہندو مت اور بدھ مت میں کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا مقصد نفس کی پاکیزگی اور بزرگی کا حصول ہے۔ جس طرح قرآن کے اختیار کرنے پر تقویٰ کا حصول یقینی ہوتا ہے۔ اسی طرح روزہ بھی تقویٰ کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ قرآن میں جہاں پر یہ کہا گیا ہے کہ اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے۔ تو وہاں یہ بھی باور کروایا گیا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

"لعلکم تتقون"

۴۔ **روزوں کی تعداد**:۔ قرآن کریم کی سورۃ بقرہ میں روزوں کے متعلق یہ بھی بتا دیا ہے۔ کہ روزہ سے مراد یہ نہیں کہ تم چھ مہینہ تو کھاتے رہو اور چھ مہینہ روزے رکھو

اور نہ ہی اتنی تعداد متعین کی گئی کہ جس کو اختیار کرنے میں مشکل درپیش ہو۔ بلکہ کہا گیا کہ یہ تو گنتی کے چند دن ہیں۔ "ایامٍ معدودات"

۵۔ معیّن ایّام :۔ اس موقعہ پر یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ چند دن سے کیا مراد ہے؟ جسے قرآن کریم کی دوسری آیت میں بالکل واضح کردیا گیا کہ وہ ایک معین مہینہ ہے جو اسے پائے یعنی اس مہینہ میں موجود ہو تو اُسے چاہتے کہ وہ پورا مہینہ روزے رکھے۔

فمن شهد منكم فليصمه۔

۶۔ بیمار و مسافر کے لئے رعایت :۔ روزوں کے سلسلے میں بیمار اور مسافر کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور اس کے لئے یہ صریح حکم موجود ہے۔ کہ جو بیمار ہو تو وہ بیماری سے فارغ ہونے کے بعد دن پورے کرے اور مسافر سفر سے فراغت کے بعد اتنے دن روزے رکھے جتنے وہ دورانِ سفر نہ رکھ سکا۔ جس طرح سورۃ بقرہ کی اس آیت سے واضح ہے۔

وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۝

۷۔ کمزوروں کے لئے رعایت :۔ روزہ کی فرضیت کے بارے میں جس طرح مسافر اور مریض کے لئے آسانی رکھی گئی ہے۔ اسی طرح ان اشخاص کے لئے جو کہ بوجہ ضعیف العمری یا جسمانی کمزوری کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکتے ہوں کہا انہیں چاہیئے کہ وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اور جو اس میں اضافہ کرے تو اس کے لئے زیادہ اجر ہے۔

وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين

۸۔ ازدواجی معاملات میں آسانی :۔ ابتدائے اسلام میں جب روزہ فرض ہوا تو پورے ماہ رمضان میں ازدواجی تعلقات کی اجازت نہ تھی۔ لیکن بعض دفعہ حضرت عمرؓ جیسے صحابہ کرام اس سختی کو برداشت نہ کر سکے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایک آسانی یہ بھی بیان فرمادی کہ تم اپنی بیویوں سے تعلقات افطاری اور سحری کے درمیان حصہ میں قائم کر سکتے ہو۔ اور اس سلسلے میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی یہ آیت بیان فرما رہی ہے۔ أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ

۹۔ **روزے کے اوقات**:۔ روزے کے لئے وقت کا تعین اس طرح کیا گیا ہے۔ کہ صبح کی روشنی نمودار ہونے سے لیکر غروب آفتاب تک اپنے آپ کو ہر قسم کی خواہشات سے روکے رکھنا۔ صحابہ اکرام کا یہ طریقہ تھا کہ وہ سحری کھانے میں دیر اور افطاری میں جلدی کرتے تھے اور سنت کا طریقہ یہی ہے۔ اس وقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ۔

۱۰۔ **رمضان اور نزول قرآن**:۔ رمضان المبارک کا مہینہ اس لحاظ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ کہ اس ماہ میں قرآن کریم کا نزول ہوا۔ اس سلسلہ میں ایک روایت تو یہ ہے کہ پورا قرآن کریم عرش عظیم سے ماہِ صیام میں اترا اور پھر بتدریج حضرت جبرائیل کے ذریعہ آنحضرتؐ پر نازل کیا گیا۔ جب کہ دوسری روایت یہ ہے کہ نبی کریمؐ پر سب سے پہلے وحی ماہِ صیام میں ہی اتری۔ بہرحال نزول قرآن اسی مبارک مہینے میں ہوا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد خداوندی ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ؕ

تحویل قبلہ

انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس تھا اور حضور اکرمؐ بھی قیام مکہ اور ہجرت مدینہ کے بعد اسی طرف رُخ کرکے نماز ادا فرماتے تھے۔

لیکن حضور کا دل بار بار چاہتا تھا کہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم کے بنائے ہوئے خانہ کعبہ کو بحیثیت قبلہ اختیار کریں۔ اور خدا تعالےٰ نے بھی اس چاہت کو سورہ بقرہ میں اس طرح بیان فرمایا۔

قد نری تقلب وجهك في السماء

بے شک ہم نے دیکھ لیا آپ کا بار بار آسمان کی طرف منہ اٹھانا۔

اللہ تعالےٰ نے اپنے پیارے حبیب کی یہ دیرینہ خواہش پوری فرما دی اور ہجرت کے سولہویں ماہ حکم خداوندی ہوا کہ فول وجهك شطر المسجد الحرام

اب اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف کر دیجئے

بیت المقدس یہود کا قبلہ تھا اور وہ کہا کرتے تھے، آخر مسلمان قبلہ تو ہمارا ہی استعمال کرتے ہیں چنانچہ جب حضور اکرمؐ نے خدا کے حکم سے اس کی منسوخی کا اعلان کیا تو یہود کو بہت ناگوار گذرا۔ وہ تو پہلے ہی حضور کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اب اس تازہ ضرب پر تلملا اٹھے اور آنحضرت پر طرح طرح کے اعتراضات کرنے لگے جن کی ہمنوائی منافقین نے بھی کی۔

اللہ تعالےٰ نے اس موقع پر فرمایا کہ اے یہو تو تمام جہاں کا مالک تو خدا ہے تم جس طرف بھی منہ کرو وہ دیکھ رہا ہے اگر بیت المقدس اس کی سرزمین ہے تو خانہ کعبہ بھی تو اسی کی ملکیت ہے جیسا کہ خود حکم ربانی ہے۔ لله المشرق والمغرب

اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کے تقویٰ کو دیکھتا ہے کہ کس کا دل اتباع کی طرف مائل ہے اور کن لوگوں کے دلوں میں کھوٹ ہے۔

اس لئے مقصد تو عبادت الٰہی ہے وہ جیسے کہے اسی طرح کرنا چاہئے۔

لن ینال الله لحومها ولا دماءها ولكن يناله التقوىٰ منكم

اس موقع پر بعض سادہ لوح انسان بھی گھبرائے کیونکہ یہود اور منافقین نے بھی ان کے دلوں

میں وسوسہ ڈال دیا کہ اے مسلمانو! اس سے پہلے تم نے جو نمازیں بیت المقدس کی جانب منہ کر کے ادا کی تھیں سب غارت گئیں۔ عین ممکن تھا کہ اس موقع پر بہت سے مسلمان متزلزل ہو جاتے فوراً حکم خداوندی ہوا۔

ماکان اللّٰہ لیضیع ایمانکم

یعنی اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ تمھارے ایمانوں کو ضائع کر دے

مقصد یہ ہوا کہ حقیقت تو عبادت کی ہے۔ رُخ کی نہیں۔ چونکہ عبادت اس کے لئے کی جاتی ہے۔ اس لئے بیت المقدس بھی اس کا تھا اور خانہ کعبہ بھی، تحویل قبلہ کا عمل کر کے یہودی تعصب کے بت کو توڑنا ہے۔

اس کے علاوہ یہاں پر ایک اور بھی بات قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ خود اسرائیلیوں کے درمیان بھی اپنے قبلے کے بارے میں باہم اتفاق نہیں۔ یہودی قوم کے کچھ افراد تو فقط ہیکل سلیمانی کو قبلہ قرار دیتے ہیں جب کہ بعض دوسرے پورے یروشلم کو نیز عیسائیت جو کہ یہودیت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے کسی مخصوص مقام کو قبلہ قرار نہیں دیتی۔ بلکہ ان کا قبلہ تو رُخ مشرق ہے۔ یعنی وہ جہاں کہیں بھی مصروف عبادت ہوں۔ مشرق کی طرف منہ کر لیں۔ یہودیوں کی اس اخلاقی کیفیت کو قرآن کی سورۂ بقرہ نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔ "ومابعضھم بتابع قبلۃ بعض"

یعنی وہ ایک دوسرے کے قبلے کی اتباع کرنے والے نہیں

اس کے بعد حضور اکرم کو اللہ تبارک و تعالیٰ تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ آپ اس بات کی فکر نہ کریں کہ یہود میری بات کو سچا نہیں سمجھتے۔ دراصل سرکشی اور نافرمانی تو اس بدبخت قوم کا شیوا بن چکا ہے۔ اور یہ کسی بھی صورت میں تمھارے قبلہ کو ماننے والے نہیں۔ "وماتبعوا قبلتک"

جب تحویل قبلہ کا بیان ہو چکا تو اس کی مزید وضاحت کے سلسلے میں اللہ تبارک تعالیٰ نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں نہ صرف قرآن پاک تحویل قبلہ کے بارے میں بیان کرتا ہے۔ بلکہ خود اسرائیلی مذہبی کتاب تورات نے بھی اس کی وضاحت کر دی تھی کہ سب سے آخر آنے والا پیغمبر آخر کار بیت الحرام کو اپنا قبلہ بنائے گا۔

یہود کی ریشہ دوانیوں کے باوجود اللہ تبارک نے صریح الفاظ میں حضورؐ سے فرما دیا کہ یہ لوگ کچھ بھی کریں اور چاہے آپ کو کچھ کہیں آپ تحویل قبلہ پر پوری طرح عمل کیجئے۔ کیونکہ یہی حق بات ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔ ۔ الحق من ربک ولاتکون من الممترین۔

کہ یہی آپ کے رب کی طرف سے حق ہے پس آپ شک میں نہ پڑ جائیں۔

(لوُرات)

حضرت موسیٰ علیہ السّلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے وہ جلیل القدر پیغمبر ہیں جن کے ذریعہ اس قوم کو ہدایت کے لئے کتاب یعنی تورات عطا کی گئی آپ کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے کا ہے۔

پیدائش

جس وقت موسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے۔ اس وقت بنی اسرائیل پر قبطی حکمرانی کرتے تھے۔ جن کا بادشاہ فرعون مصر کے نام سے مشہور تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت بنی اسرائیل کی یہ حالت تھی کہ ان کے ہاں جو لڑکا بھی پیدا ہوتا فرعون کے حکم سے قتل کر دیا جاتا۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی یہ خطرہ لاحق ہوا کہ ابھی فرعون کے جلاد آکر اس کے لختِ جگر کو اسکی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے کر دیں گے لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اللہ نے آپ کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ آپ کو ایک صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا جائے۔ آپ کی والدہ نے ایسا کر دیا لیکن آپ کی بہن کو کہا کہ تم دریا کے کنارے سنبھل کر چلتی رہو اور دیکھو کہ یہ صندوق کہاں پہنچ جاتا ہے۔

اللہ کی قدرت کہ وہ صندوق دریا سے نکلنے والی ایک نہر کے ذریعے فرعون کے محل میں جا لگا۔ فرعون کی بیوی نے جب نہر میں بہتا ہوا صندوق دیکھا تو اسے اشتیاق ہوا کہ اس میں کیا ہے۔ صندوق کو باہر نکلوایا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس میں ایک چاند سا بچہ اپنا انگوٹھا چوس رہا ہے۔

کیونکہ فرعون کی اس بیوی کے ہاں کوئی نرینہ اولاد نہ تھی لہٰذا اس نے اپنی بیٹی کے اصرار پر اس بچے کو اپنے گھر میں پالنے کے لئے سوچا اور حضرت موسیٰ کی پرورش خود ان کی اپنی ہی ماں کے ذریعہ فرعون کے خرچ پر ہوئی۔

حضرت موسیٰ کا مصر سے ہجرت کرنا

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سنِ شباب کو پہنچے تو دیکھا کہ قبطی اسرائیلیوں پر بے پناہ ظلم ڈھا رہے ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے دیکھا کہ ایک قبطی اسرائیلی سے الجھ رہا ہے۔ اسرائیلی نے مدد کے لئے موسیٰ علیہ السلام

کو بلایا۔ آپ نے قبطی کو ایسا گھونسا مارا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ جس کا راز دوسرے دن اسی اسرائیلی نے فاش کر دیا اور لوگوں نے فرعون تک یہ بات پہنچادی۔ ادھر آپ نے مصر کو چھوڑنے کا ارادہ کیا کیونکہ آپ کو خدشہ تھا کہ فرعون قبطی کی موت پر غم و غصہ کا نہ صرف اظہار کرے گا بلکہ اس کا بدلہ لینے کے لئے ہر ممکن قدم اٹھائے گا۔

حضرت موسیٰؑ کی حضرت شعیبؑ سے ملاقات

جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے اور نا معلوم منزل کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں ایک بستی کے قریب آپ سستانے کے لئے ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ قریب ہی بہت سے لوگ کنوئیں میں سے پانی نکال کر اپنے جانوروں کو پلا رہے تھے اور دو جوان لڑکیاں کچھ فاصلے پر اپنی بکریاں لئے کھڑی تھیں آپ نے ان سے پوچھا کہ تم کیوں کھڑی ہو۔ انھوں نے کہا ہمارا باپ بوڑھا ہو چکا ہے۔ اور ہم کنوئیں سے پانی نکالنے کی طاقت نہیں رکھتیں۔

سب لوگوں کے جانے کے بعد ہم بچا کھچا پانی اپنے جانوروں کو پلاتی ہیں۔ آپ فوراً وہاں سے اٹھے اور سب سے پہلے پانی نکال کر ان لڑکیوں کے جانوروں کو پلایا۔ جنھوں نے جا کر اپنے والد سے حال بیان کیا اور انھوں نے آپ کو بلا بھیجا۔ یہ لڑکیاں حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیاں تھیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شادی اور اولاد

شعیب علیہ السلام نے آپ سے کہا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور ان لڑکیوں کی دیکھ بھال کے لئے کوئی نہیں۔ اگر تم آٹھ سال تک میری بکریاں چراؤ تو بڑی لڑکی کا تم سے نکاح کر دوں گا اور اگر تم دس سال تک یہ خدمت انجام دو تو تمھاری مہربانی۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا جس کے بعد بڑی لڑکی سے آپ کا عقد کر دیا گیا۔ اور پھر اللہ نے آپ کو بیٹا بھی عطا فرمایا۔

موسیٰ علیہ السلام کی وطن واپسی اور جلوۂ طور

ایک عرصہ بعد جب موسیٰ علیہ السلام کو وطن کی یاد آئی اور انھوں نے سوچا کہ اب تو فرعون مصر مر کھپ چکا ہوگا، تو وہ اپنی بیوی کو لے کر اپنے وطن کی طرف روانہ ہوئے۔ سردی کا موسم تھا۔ جب آپ

کوہ طور کے قریب پہنچے تو ایک طرف سے شعلہ لپکتا ہوا دیکھا۔ بیوی کو بٹھا کر آگ حاصل کرنے کے لئے اس شعلہ کی طرف چل دیئے۔ لیکن دراصل وہ آگ کا شعلہ نہیں اللہ تبارک و تعالیٰ کی تجلی تھی۔ آپ کے پہنچتے ہی آواز غیبی ہوئی۔ اے موسیٰ آپ پاک جگہ پر کھڑے ہوئے ہیں جوتیاں اتار دیجئے۔ اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ آپ سے ہم کلام ہوئے اور اس وقت آپ کو وہ معجزات یعنی آپ کی لاٹھی کا سانپ بن جانا اور ید بیضاد یا گیا اور آپ کو تاکید کی گئی کہ واپس جاکر فرعون کو دعوت اسلام دو۔

مصر میں آمد اور معجزات کا ظہور

جب آپ کے مصر آنے کی اطلاع آپ کے بھائی ہارون کو ہوئی تو انھوں نے بنی اسرائیل کے ساتھ آپ کا پرجوش استقبال کیا۔ آپ نے فرعون کو حق کی دعوت دی اور وہ دونوں معجزات جو آپ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے کوہ طور پر عطا فرمائے تھے اس قوم کو دکھائے لیکن بجائے ایمان لانے کے فرعون نے آپ کو جادوگر قرار دیا اور اپنے ملک کے نامور جادوگروں کو آپ کے مقابلے کے لئے پیش کیا جو حقیقت کو پاکر آپ پر ایمان لے آئے اور فرعون کے ہاتھوں سخت مشکلات اٹھاتے ہوئے شہید ہو گئے۔

فرعون کا انکار اور عذاب الٰہی

فرعون نے جب موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے انکار کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمیں اس ملک سے جانے دو لیکن اس نے اسرائیلوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جس کی بنا پر بتدریج حسب ذیل عذابوں نے فرعون کو آگھیرا۔

(۱) تمام مصر کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا۔
(۲) ہر جگہ پر مینڈک ہی مینڈک چڑھ آئے۔
(۳) اللہ تعالیٰ نے فرعون کی ہر چیز میں جوئیں بھر دیں۔
(۴) تمام مصر پر ٹڈی دل نے حملہ کر دیا اور کوئی سبز چیز نہ چھوڑی۔
(۵) جانوروں کی عام بیماری کی وجہ سے لاتعداد جانور ہلاک ہوئے۔
(۶) اللہ کے حکم سے موسیٰؑ نے راکھ آسمان کی طرف بکھیر دی جس کی وجہ سے تمام انسان و حیوانات پھنسیوں کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔

(۷) مصر میں ایسی ژالہ باری ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔

(۸) تمام مصر میں تین دن تک ایسی اندھیری پھیلی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

(۹) آخر میں مصریوں پر سب سے بڑا عذاب یہ ہوا کہ اللہ نے موسیٰ کو فرمایا کہ تم چاند کی چودھویں رات کو ایک بکری کی قربانی دو اور اس کے خون سے اپنے دروازوں پر نشان لگا دو۔ رات کو حضرت عزرائیل آئیں گے اور جس گھر کے دروازے پر نشان نہ ہوگا اس گھر میں سب سے پہلے پیدا ہونے والے کو مار دیا جائے گا۔

یہ ایسا عذاب تھا کہ فرعونیوں کا ہر گھر ماتم کدہ بن گیا۔ لہٰذا اس نے عاجز آکر موسیٰؑ سے کہا کہ تم بنی اسرائیل کو لے کر چلے جاؤ اور اپنے خدا کو قربانی دو میرے لئے بھی دعا مانگو اور جلدی واپس آنا۔

فرعون کا بنی اسرائیل کا پیچھا کرنا

بنی اسرائیل ابھی بحیرۂ قلزم کے کنارے خیمہ نصب کر ہی رہے تھے کہ فرعون مع اپنی فوج کے ان کے سر پر آکھڑا ہوا۔ بنی اسرائیل سخت گھبرائے اور موسیٰؑ سے کہا کہ کیا مصر میں ہماری قبروں کے لئے جگہ نہ تھی جو ہمیں یہاں لے آئے۔ موسیٰؑ نے خدا سے دعا کی اور اللہ تعالےٰ نے قدرتی طور پر سمندر کے بیچوں بیچ بنی اسرائیل کے لئے راستہ بنا دیا "واذ فرقنا بکم البحر" لیکن فرعون بھی راستہ دیکھ کر دریا میں اترا تو اللہ کے حکم سے دریا دوبارہ آپس میں مل گیا اور فرعون مع اپنی قوم اور ساز و سامان کے غرق ہوگیا اور فرعون کا یہ تمام حشر بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے دیکھا "واغرقنا آل فرعون وانتم تنظرون" اور اللہ تعالےٰ نے انسانوں کی عبرت کے لئے فرعون کی نعش کو تاقیامت باقی رہنے دیا۔

فرعون سے نجات پانے کے بعد جب بنی اسرائیل آگے بڑھے تو ان کے سامنے لق و دق صحرائے سینا کا میدان تھا جہاں نہ پینے کو پانی اور نہ کھانے کو خوراک اور نہ دھوپ سے بچنے کو سایہ، خدا نے اپنے فضل و کرم سے ان تینوں چیزوں کا انتظام فرما دیا۔

(۱) وظللنا علیکم الغمام (۲) وانزلنا علیکم المن والسلوىٰ (۳) فانفجرت منہ اثنتا عشرۃ عینا

اس کے بعد اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر بلایا تاکہ انھیں ایک عظیم معجزہ

یعنی کتاب عنایت کی جائے۔ آپ کی غیر موجودگی میں بنی اسرائیل نے سونے کا بچھڑا بنا کر اسے پوجنا شروع کر دیا جس کی بنا پر اللہ کا عذاب نازل ہوا اور وہ یہ کہ بنی اسرائیل خود ایک دوسرے کو قتل کریں۔

تورات عطا کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو حسب وعدہ اللہ تعالیٰ نے ملک کنعان کی بادشاہت عطا کی اس بادشاہت سے پہلے بنی اسرائیل چالیس برس تک صحراؤں میں بھٹکتے رہے۔

بادشاہت ملنے کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ یہ قوم خالص اللہ کے لئے عبادت کرتی لیکن پھر اس نے کفر و شرک اور پیغمبروں کو جھٹلانے جیسے عظیم گناہ شروع کر دیے جس کے بعد مختلف بادشاہوں نے ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے۔ اور اللہ تعالےٰ نے بھی انہیں تاقیامت ذلیل و خوار رکھنے کا وعدہ کیا۔

ضربت علیهم الذلة والمسكنة وباء وبغضب من الله

تفسیر

سُورہ البقرۃ کی چند آیات

(نوٹ) طلبہ کو تفسیر ماجدی، حقانی یا ابن کثیر کا مطالعہ ضروری ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات کی تشریح کی جاتی ہے تاکہ طلبہ اس کی روشنی میں مزید مطالعہ کر سکیں۔

(۱) مثلھم کمثل الذی استوقد ناراً فلما اضاءت ما حولہ ذھب اللہ بنورھم وترکھم فی ظلمت لایبصرون ۝

ترجمہ:۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی تو جب ان کے پاس روشنی ہو گئی تو اللہ نے ان کی روشنی کو سلب کر لیا اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہیں۔

تشریح اس آیت میں منافقوں کا حال مثال کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے کہ ان کی مثال یوں ہے کہ کوئی اندھیری رات میں مشکل سے روشنی حاصل کرے اور یہ دیکھ کر خوش ہو کہ اس کے چاروں طرف کی چیزیں نظر آ رہی ہیں اور وہ پوری طرح غور بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اللہ نے اچانک اس کی آنکھوں کی بینائی سلب کر لی اور وہ حیران رہ گیا۔

صاحب ماجدی فرماتے ہیں کہ حقانیت کی آگ خوب روشن ہو گئی اور ہدایت کا نور ہر طرف پھیل گیا تو اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے انہوں نے اپنی بصارت کو ضائع کر دیا اور اس کی روشنی سے محروم ہو گئے۔

عبدالحق حقانی فرماتے ہیں کہ یہ لوگ تعصب اور حب مال وجاہ کی ظلمت میں اس قدر غرق ہیں کہ کسی ہدایت کرنیوالے کی بات نہیں سن سکتے۔ یوں سمجھئے کہ انہوں نے دنیا میں کلمۂ توحید کو آڑ بنا کر مال غنیمت جیسے فوائد حاصل کر لئے۔

منافقین کی حالتیں (۱) اس آیت میں منافقین کی پہلی حالت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ جوں ہی اسلام کی روشنی پھیلی منافقین نے دیکھ لیا کہ یہ موقع اسلام کے نام سے فائدہ اٹھانے کا ہے تو انہوں نے فوراً کہا کہ ہم تو تمہارے بھائی ہیں اور اس طرح اسلام کی آڑ

لے کر غزوات سے حاصل کردہ مالِ غنیمت میں شریک ہوجاتے اور جب میدان جنگ میں لڑنے کی نوبت آتی تو بہانہ بنا کر پیچھے ہٹ جاتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن سے کہا کہ تم کب تک بہانے بازی کرتے رہو گے تمہارے کیئے کی سزا تمہیں ضرور ملے گی۔

۲۔ دوسری تمثیل میں ان کی تین اہم کمزوریاں بیان کی گئیں ہیں: (۱) یہ اندھیرے میں ہیں کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ اللہ کی مہربانیاں ہیں ان کو دیکھ کر یہ سبق نہیں سیکھتے۔ دراصل ان کی آنکھوں پر تعصب اور ہٹ دھرمی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔

(۲) یہ گونگے ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ اگر حضورِ اکرم ؐ سے صحیح حالات بیان کردیں تو وہ انہیں معاف کردیں گے مگر کہتے نہیں کہ بھرم ٹوٹ جائیگا۔

(۳) یہ بہرے ہیں نبی کریم دن رات اللہ کی تعریفیں بیان کرتے رہتے ہیں اور لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتے ہیں مگر یہ ان باتوں پر کان نہیں دھرتے۔

(۲) واذ قال ربك للملٰئكة انی جاعل فی الارض خلیفه۔ قالوا اتجعل فیها من یفسد فیها ویسفك الدما۔ نحن نسبح بحمدك ونقدس لك قال انی اعلم مالا تعلمون ○

ترجمہ اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ بیشک میں زمین پر ایک نائب بنانا چاہتا ہوں۔ فرشتوں نے عرض کیا آپ اسے نائب بنا رہے ہیں جو کہ زمین میں فساد برپا کرے اور خون بہائے ہم تو آپ کی تعریف کرتے ہیں تسبیح اور بزرگی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا بیشک جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

تشریح اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ دیکھو میں اپنی مخلوق کے لئے زمین پر اپنا ایک نائب مقرر کر رہا ہوں جو کہ میرے احکامات پر عمل درآمد کرانے کا ذمہ دار ہوگا اور وہ خلیفہ انسانوں میں سے ہوگا۔

فرشتوں نے عرض کیا کہ اے رب العزت آپ خلیفہ بھی بنا رہے ہیں تو ایسی ہستی کو، جو خونریزی کرے اور پرسکون ماحول کو تہہ و بالا کرے چونکہ اللہ تعالیٰ کو سب علم تھا لہٰذا اللہ پاک نے فرشتوں سے کہا کہ تمہارا علم محدود ہے اور تم حقیقتِ حال سے پوری طرح واقف نہیں ہو اور جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ میں بہتر جانتا ہوں

حقیقتِ گفتگو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی فوقیت کو ثابت کرنا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ فرشتے لاجواب رہ جائیں اور جیسا کہ تفسیر حقانی و ماجدی میں بیان کیا گیا ہے کہ فرشتوں نے اپنی حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کمال ہے خلافت جیسا اعلیٰ اعزاز اس مخلوق کو دیا جا رہا ہے تخریب جس کی گھٹی میں پڑی ہے لیکن یہ فرشتے اس حقیقت سے واقف نہ تھے کہ انسانوں کا خلیفہ بھی تو انسان ہی ہونا چاہیئے نہ کہ فرشتے یا جن اور جب حضرت آدم کو ان کے سامنے لایا گیا اور انہوں نے چیزوں کے نام بتائے تو حضرت آدم کے علمی مرتبہ کا انہیں احساس ہو گیا اور وہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ اے خدا ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہمیں بتلایا ہے۔

(۳) - ان الذین کفروا سواء علیهم ء انذرتهم ام لم تنذرهم لا یومنون - ختم الله علی قلوبهم وعلی سمعهم وعلی ابصارهم غشاوة ولهم عذاب عظیم ٥

ترجمہ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا تو ان کے لئے برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔

ختم اللہ پر نوٹ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہر لگا دینا بندے کے کفر اختیار کرنے کے بعد ہوتا ہے نہ کہ اس سے پہلے۔ جب انسان اپنی عقل کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے اور وہ غلط راہ اختیار کرتا ہے تو پھر مدد خداوندی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور پھر اسے روشنی تاریکی اور تاریکی روشنی نظر آنے لگتی ہے اور کانوں پر بھی مہر ہے لہٰذا سن بھی نہیں سکتے ایک طریقہ یہ تھا کہ پیغمبر کے معجزات دیکھ کر ایمان لے آتے لیکن ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے

تبلیغ کا فائدہ جہاں تک ان لوگوں کو تبلیغ کرنے کا تعلق ہے وہ تو پیغمبر کا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو تسلی دے رہے ہیں کہ آپ کی تبلیغ میں کوئی کسر نہیں۔ یہ لوگ تو ازلی بدبخت ہیں آپ اپنا مشن جاری رکھیں۔

جس طرح انسان کے زہر کھانے سے موت واقع ہو جاتی ہے اسی طرح جان بوجھ کر غلط راہ پر چلنا روحانی موت ہے جس طرح مردہ زمین کے لئے بڑی سے بڑی بارش۔ اندھے کیلئے سورج کی روشنی اور ہیضے کے مریض کے لئے اچھی سے اچھی خوراک بیکار ہے اسی طرح ان کے لئے تبلیغ کا کوئی فائدہ

نہیں جیسے ابوجہل وغیرہ کہ بدبختی وغیرہ ان کے حصہ میں آچکی تھی وہ ایمان نہ لائے اور انہی لوگوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آنکھیں اور کان رکھنے کے باوجود نہیں سمجھتے۔

(۲)- الم- ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدًی للمتقین ۝

ترجمہ الم- یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں- پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔

تشریح اس آیت میں لفظ کتاب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب تحریر میں موجود ہے نہ کہ دوسرے مذاہب کی کتابوں کی طرح جو کہ سینہ بہ سینہ چلیں اور بعد میں تدوین کی گئیں۔ توریت، انجیل اور دوسری کتابیں اصلی حالت میں موجود نہیں لیکن یہ دعویٰ تو صرف قرآن شریف ہی کر سکتا ہے کہ یہ کامل ہے۔ قرآن کے منکرین یہ بات کہنے پر مجبور ہیں کہ جتنی کتابیں لکھی گئیں دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانیوالی کتاب قرآن کریم ہے۔

پس یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں اور جہاں تک ایمان لانے کا تعلق ہے تو یہ جان لینا چاہیئے کہ یہ ہدایت نامہ ہے اور مکمل دستور حیات ہے۔

متقین اور ان کی خصوصیات متقین کی قید لگا کر یہ صاف صاف بتا دیا کہ اس ہدایت سے جو کہ عام ہے لیکن فائدہ وہی اٹھائیں گے جن کے اندر حق کی طلب و تلاش ہوگی جن کے اندر خوف خدا ہوگا اور جن کا ضمیر زندہ ہوگا۔ اس کی مثال بالکل اسی طرح ہے جیسا سورج اپنی جگہ بہت روشن ہے لیکن جس کی آنکھوں کی بینائی نہیں اس کے لئے تیز ترین کرن بھی بیکار ہے۔

متقین کی پہچان ۱- وہ لوگ جو صرف رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے یعنی غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔

۲- وہ نماز کے پابند ہوتے ہیں۔

۳- جو کچھ بھی اللہ نے دیا اس میں سے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

۴- رسول ﷺ کے پیش کردہ ہر پیغام پر یقین رکھتے ہیں۔

۵- وہ دوسرے پیغمبروں پر بھی ایمان رکھتے ہیں خواہ وہ کسی زمانہ ملک یا کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں

۶- آخرت پر ایمان ان کا عقیدہ ہے۔

۵ واذقلنا للملئكة اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس - ابی واستکبر وکان من الکافرین ○

ترجمہ: اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔

تفسیر: اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تمہارے باپ حضرت آدم کو اتنی عزت دی کہ دوسری مخلوق کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرے اور شیطان نے سجدہ نہ کیا جو کہ دراصل کافر تھا۔

جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ زمین پر ایک خلیفہ بنا رہا ہوں اور پھر علم کی بنا پر اس کی فوقیت فرشتوں پر ظاہر کر دی اور فرشتوں نے اقرار بھی کر لیا تو ضروری ہوا کہ عملی طور پر بھی ان سے آدم کی تعظیم کرائی جائے اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ تم تعظیماً ہمارے حکم پر عمل کرتے ہوئے آدم کے آگے جھک جاؤ۔ اس آیت میں سجدہ سے مراد سجدہ نماز نہیں بلکہ صرف سجدہ ہے اور اس کے لفظی معنی عجز و انکسار کے ہیں۔ پوری اُمت مسلمہ اس بات پر متفق ہے کہ آدم کو فرشتوں کا سجدہ کرنا سجدۂ تعظیمی تھا جس طرح ہم قبلہ کی جانب رُخ کر کے سجدہ کرتے ہیں تو وہ سجدہ تو خدا کے لئے ہوتا ہے نہ کہ قبلہ کیلئے آدم تو صرف سمت کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے ان کی بڑائی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

جہاں تک ابلیس کا تعلق ہے تو وہ فرشتہ نہیں تھا بلکہ جن تھا جو ناری ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے "خلقتنی من النار" اس کا شمار کافروں میں ہونے کا سبب اس کی نافرمانی ہے۔ یعنی اُس نے اللہ کے حکم سے انکار کیا اور اسی بنا پر اس کا شمار کافروں میں ہو گیا اور یہ ہمیشہ کے لئے مردود ٹھیرایا گیا۔

۶ ومن الناس من یقول آمنا باللہ وبالیوم الاخر۔ وما ھم بمومنین۔ یخادعون اللہ والذین آمنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون ○

ترجمہ: اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ اور روز آخرت پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں ہیں یہ دھوکہ دے رہے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو لیکن حقیقت میں یہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور اس کا بھی انہیں احساس نہیں

اللہ کو کس طرح دھوکہ دیتے ہیں

۱۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ اور یوم آخرت پر۔ حالانکہ وہ ایمان والے نہیں ہیں۔ آپ ان منافقوں سے ہوشیار رہیں۔

۲۔ ایک طرف تو یہ منافقین اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور دوسری طرف آپس میں کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں اور ان کے پیغمبر کو دھوکہ دے رہے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کو نہیں اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ سب کچھ اسلئے کر رہے ہیں کہ ان کے دل مردہ ہو چکے ہیں اور یہ اتنا بڑا جھوٹ کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لا چکے ہیں۔ حالانکہ یہ ایمان لانے والے نہیں۔

۴۔ جب منافقین مسلمانوں سے ملتے تو کہتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں تاکہ مال غنیمت حاصل کر سکیں اور جب اپنے شیطانوں کے پاس جاتے تو قسم کھا کر کہتے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔

(۷)۔ إن الصفا والمروة من شعائر الله فمن حج البيت او اعتمر فلا جناح عليه ان يطوف بهما ومن تطوع خيراً ان الله شاكر عليم ○

ترجمہ بے شک صفا اور مروہ اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں بس جو کوئی حج یا عمرہ کرے اس پر کچھ گناہ نہیں کہ ان دونوں کے درمیان آمد و رفت کرے۔ اور جو کوئی اچھا کام کرے اس کیلئے بہتری ہے تو بیشک اللہ بڑا قدردان اور بڑا علم والا ہے۔

فلا جناح کی تشریح جب حج مسلمانوں پر فرض کیا گیا اور حضرت ہاجرہ کی سنت کو تازہ کرنے کے لئے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کو لازمی قرار دیا گیا تو کافرین اور منافقین نے مسلمانوں کو بہکانا شروع کیا کہ جس طرح ہم اپنے بتوں کو دوڑ کر چھوتے ہیں اسی طرح تم بھی بھاگتے رہتے ہو آ گئے نا ہمارے رستے پر۔ مسلمان سوچ میں پڑ گئے کہ کہیں سعی واقعی گناہ نہ ہو۔

دراصل صفا اور مروہ کو تو توحید کے خاص گھرانے سے ایک نسبت تھی یعنی حضرت ہاجرہ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ سے لیکن بعد میں مشرکین نے ان پہاڑوں پر ایک ایک دیوی کی مورتی نصب کر دی تھی اور جب یہ مشرک تیرتھ کرنے جاتے تو ان مورتیوں کو بھی دوڑ دوڑ کر چھوتے اور چومتے

مسلمانوں کی تشفی کے لئے اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتے ہیں کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا گناہ نہیں بلکہ باعث اجر و ثواب ہے۔ فقہا کے نزدیک یہ سعی واجب ہے مالکی اور شافعی حضرات کے نزدیک فرض اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک سنت ہے اور یہ آمد و رفت سات مرتبہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا کہ اس کے اں صلہ نیک کاموں کا ملتا ہے اور وہ عمل کرنے والے کی نیت سے بھی واقف ہے۔

اللہ پاک شاکر ہیں یعنی وہ اپنے بندوں کو معمولی سی عبادت پر بھی بہت زیادہ ثواب دیتے ہے اور لفظ علیم سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جس نیت سے کوئی عمل کریگا اس کا پھل ملے گا۔ کیونکہ اللہ کے یہاں مادی اشیاء کی کوئی حیثیت نہیں۔

(۸) واتبعوا ما تتلوا الشیٰطین علیٰ ملک سلیمان۔ وما کفر سلیمان ولکن الشیٰطین کفروا یعلمون الناس السحر۔ وما انزل علی الملکین ببابل ھاروت وماروت ۝

ترجمہ اور اتباع کی جو پڑھتے تھے شیاطین سلیمانؑ کی بادشاہت میں اور سلیمان نے کفر نہیں کیا البتہ یہ شیاطین کفر کرتے تھے۔ لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے اور جو اتارا گیا ان دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر بابل میں۔

تشریح یہ آیت بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کی داستان کا ایک حصہ ہے کہ کس طرح یہ لوگ بری عادتوں میں پڑتے اور انہیں جائز قرار دینے کے لئے اپنے ہی پیغمبروں سے منسوب کر دیتے ان کی کتابیں گواہ ہیں کہ یہ لوگ دنیاوی لالچ و طمع کے لئے کسی بھی ناجائز کام کرنے سے پرہیز نہ کرتے۔

ائمہ کا نقطہ نظر ۱۔ حضرت سلیمانؑ کے عہد میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی آزمائش کیلئے ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں کو شہر بابل میں اتارا جو انسانی شکل میں تھے۔

۲۔ دو انسان تھے مگر اس قدر نیک کہ ان کی خصلتیں فرشتوں جیسی تھیں۔ فرشتہ نما انسان یا بادشاہ، انہوں نے بابل کے پر رونق بازار میں ایک دکان لگائی اور لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے۔ تعلیم دینے سے پہلے یہ بتا دیتے کہ دیکھو یہ کام اچھا نہیں اور ہم تو تمہاری آزمائش کے لئے آئے ہیں پھر بھی

ان سے کہتے کہ خدا کی قسم آپ صرف ہمیں بتا دیں ہم عمل نہیں کریں گے مگر سیکھنے کے بعد وہ اچھے بھلے خاندانوں میں تفرقہ ڈال دیتے خصوصاً میاں بیوی کے معاملات میں۔ اور اس علم کو زیادہ تر عورتیں سیکھتی تھیں۔

اللہ تعالیٰ حضورِ اکرم کو بتا رہے ہیں کہ ان لوگوں نے جو یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سلیمانؑ کو اتنی بڑی بادشاہت حاصل تھی وہ جادو کے زور سے تھی تو یہ غلط ہے کیونکہ سلیمانؑ تو ہمارے نبی تھے وہ کیسے کفرانہ باتوں پر عمل کرتے یہودی تو اس بات پر فخر کرتے تھے کہ جھاڑ پھونک سے بڑے سے بڑا کام نکل سکتا ہے تو پھر میدانِ جنگ میں جانے سے کیا فائدہ۔؟ یہودی ہی ایک عورت نے آپؐ پر جادو کر دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مطلع کر دیا۔ لیکن آپؐ ایک عرصے تک اس کا اثر محسوس کرتے رہے۔

الغرض اس آیت میں ان کی اگلی و پچھلی عیاریوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۹۰) اوکصیب من السماء فیہ ظلمات و رعد وبرق۔ یجعلون اصابعہم فی اٰذانہم من الصواعق حذر الموت واللہ محیط باالکٰفرین ۝

ترجمہ یا پھر جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو۔ اس میں اندھیرا ہے بجلی کی گرج چمک ہے اور وہ خوف سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتے ہیں بجلی کی کڑک کے سبب اور موت کے اندیشے سے۔ حالانکہ اللہ ان کافروں کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے

آیت کن لوگوں سے متعلق ہے یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے۔ اس آیت میں دوسری مثال دی ہے کہ یہ منافقین موت کے ڈر کی وجہ سے بجلی کی کڑک سن کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ یہ میدانِ جنگ میں ہوں یا گھروں میں اللہ پاک ان کو گھیرے میں لئے ہوئے ہے اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

موت سے ڈرنے سے مراد یہ منافقین بجلی کی کڑک سن کر موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ منافقین کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ ایک وہ جو دل کی گہرائیوں سے کہہ چکے ہیں کہ وہ ظاہراً مسلمان رہیں گے اور در پردہ کفر پر قائم رہیں گے۔

۲۔ دوسرے وہ جو شک و شبہے میں رہتے ہیں یعنی کسی موقع پر ان کا ضمیر اسلام کی طرف راغب ہو جاتا ہے مگر جب وہ اسلام کی سختیاں دیکھتے ہیں تو پیچھے ہٹ جاتے ہیں جیسا کہ انہوں نے جنگِ اُحد میں حضور کے ساتھ کیا تھا۔ جب حضور اکرم صحابہ کے ساتھ جنگ کیلئے میں تشریف لے گئے تو منافقین نے دیکھا کہ دشمن کا لشکر تعداد میں زیادہ ہے تو یہ بدبخت وہاں سے موت کے ڈر سے بھاگ گئے کہ مارے نہ جائیں۔ جب مالِ غنیمت کا وقت آیا تو یہ حصہ لینے کے لئے فوراً مسلمانوں سے مل جاتے۔

(۱۰) یٰبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم وانی فضلتکم علی العالمین۔

ترجمہ اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں بخشی اور تمہیں پورے جہان پر فضیلت دی۔

بنی اسرائیل آیت بالا کی روشنی میں اس آیت میں آشنا بنایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میری نعمتوں کو یاد کرو اور خصوصاً اس نعمت کو جس نے تمہیں دوسری قوموں پر فضیلت بخشی۔ آیات کے سیاق و سباق کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس قوم کی پوری تاریخ ہمارے سامنے آ جاتی ہے جو حسب ذیل ہے۔

بنی اسرائیل دراصل حضرت یعقوبؑ کی اولاد ہیں حضرت یعقوب کا لقب اسرائیل تھا اور اسی مناسبت سے یہ قوم بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔ یعنی اسرائیل کی اولاد۔ حضرت یعقوبؑ اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں میں سے تھے۔ آپ کے زمانے میں اور آپ کے بعد ایک عرصے تک یہی قوم دنیا میں کامیاب ترین زندگی گذار رہی تھی۔ اسی قوم میں حضرت سلیمانؑ حضرت داؤد جلیل القدر پیغمبر پیدا ہوئے مگر ایک وقت ایسا آیا کہ اس قوم کی نافرمانیاں اسے لے ڈوبیں اور فرعون جیسے ظالم بادشاہ کو ان پر عذاب کی صورت میں مسلط کیا گیا۔ جس کے عہد میں ان کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر تھی لیکن خدا کی رحمت پھر ایک بار جوش میں آئی اور حضرت موسیٰؑ کو اس قوم کا نجات دہندہ بنا کر بھیجا لیکن اس پر بھی اس قوم نے بڑی ناشکری کی۔ جب موسیٰؑ نے انہیں فرعون سے نجات دلائی اور بغیر محنت و مشقت کے ان کیلئے زندگی کی ضروریات فراہم کر دیں اور ان کے ذمہ صرف ایک کام تھا کہ اللہ کی بندگی کرو مگر انہوں نے کفرانِ نعمت کی ٹھانی اور تنبیہ کے باوجود جب یہ راہِ راست پر نہ آئے تو آخر کار اللہ نے پھر ان پر ٹائٹس جیسا ظالم و جابر

حکمران مسلط کیا جس نے اُن کی عبادت گاہوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اور پھر نازیوں کے ذریعہ ان کا اتنا وسیع قتل عام کیا گیا کہ وہ قوم جو کسی زمانے میں دنیا کی آبادی کا کثیر حصہ تھی قلیل حصہ بن کر رہ گئی۔

(۱۱) ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا الم تعلم ان اللہ علی کل شیئٍ قدیر ۝

ترجمہ ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو کوئی اس سے بہتر یا مثل اس کے لے آتے ہیں۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تشریح اس آیت میں یہود کے ایک اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔ یہود مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ تم کہتے ہو کہ ہماری طرف وحی آتی ہے اور ہوتا یہ ہے کہ آج ایک حکم ملا تو کل اس کے برعکس دوسرا حکم نافذ ہو جاتا ہے حالانکہ اگر تم پر واقعی وحی اترتی تو ایسا نہ ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا دین تو یکساں ہے۔ خصوصاً ہماری توریت اور انجیل کے خلاف تمہیں حکم کیوں دیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم جو ایک حکم کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں تو اس میں تمہارے لئے بہتری ہے۔

مثال کے طور پر جیسے کہ شراب کی ممانعت کا حکم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شراب بتدریج حرام کی گئی اس لئے کہ اہل عرب اس کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ یک لخت اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ان کیلئے نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ جہاں تک توراۃ و انجیل کا تعلق ہے تو وہ محض باتیں جو پادریوں نے اپنے مقصد کی بنیاد پر کتابوں میں شامل کر دی تھیں ان کو قرآن جو کہ حکمت کا خزانہ ہے کیونکر صحیح بتا سکتا ہے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کسی حکم کا مٹا دینا یا اسی طرح کا دوسرا حکم لے آنا امرِ خداوندی ہے اور اس میں تمہارے لئے بہتری بھی۔ نسخ کی گنجائش صرف احکام میں ہو سکتی ہے اس کے علاوہ عقائد، اخلاقیات و گذشتہ زمانے کے حالات اور غیب کی خبروں میں قطعی گنجائش نہیں۔

پرچہ دوم

تعارف حدیث

علم حدیث کی تعریف:۔ علم حدیث اس علم کو کہتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال افعال اور تقریرات سے بحث کی جائے۔

موضوع:۔ رسول ہونے کی حیثیت سے رسول اللہ صلعم کی ذات گرامی علم حدیث کا موضوع ہے۔

غایت:۔ سعادت دارین کا حصول اس علم کا فائدہ ہے۔

حدیث وسنت کا فرق:۔ حدیث کے لغوی معنی ہیں (اخبار) خبر دینا، بتانا، اس کے بعد ہر وہ قول، فعل یا تقریر جو رسول اللہ کی جانب منسوب ہو اسے حدیث کہا جائے گا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر تدریب میں لکھتے ہیں۔

شریعت کی اصطلاح میں حدیث سے وہ امور مراد ہیں جن کی نسبت رسول اللہ کی طرف کی جائے۔

سنت کے لغوی معنی طریقہ ہیں۔ پھر اس دینی طریقہ کے لئے سنت کا لفظ بولا جائے گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا ہو۔ سنت اعمال نبوی کے لئے خاص ہے جبکہ حدیث قول اور عمل دونوں کے لئے عام ہے۔

اکثر محدثین خصوصاً متاخرین کے راجح قول کی بنا پر حدیث اور سنت دونوں متبادل ہیں۔ اور ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کیا جاتا

دوسرے علوم سے حدیث کا تعلق:۔ قرآن کریم سے لے کر ان تمام دینی علوم تک جو مسلمانوں نے ایجاد کئے کوئی علم ایسا نہیں جس کا تعلق حدیث سے نہ ہو۔ قرآن سے حدیث کا یہ تعلق ہے کہ وہ قرآن کا بیان اور اسکی تفسیر ہے جبکہ بغیر قرآن پر کامل طور سے عمل کرنا بھی ممکن نہیں۔ دوسرے علوم میں سے علم کلام، علم فقہ، علم اخلاق اور فن تصوف کی بنیاد قرآن کے بعد حدیث پر بھی ہے۔ وہ علوم جو دینی علوم کے لئے معاون ہیں مثلاً لغت صرف، نحو، معانی۔ بیان ان میں احادیث سے بکثرت استشہاد کیا جاتا ہے۔ دوسرے ایسے علوم جن کا بظاہر قرآن وحدیث سے تعلق نظر نہیں آتا۔ مثلاً فلکیات، طبعیات، طب، ریاضی، منطق، ان سے بھی حدیث کا اتنا تعلق ضرور ہے کہ کم از کم مسلمان مصنفین ان کے مسائل میں حدیث اور قرآن سے موافقت اور مخالفت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ بعض ایسے علوم ہیں جن کا مخصوص تعلق علم حدیث سے بھی ہے۔ مثلاً فن اسماء الرجال، علم جرح و تعدیل وغیرہ اس قسم کے سو سے زیادہ علوم ہیں۔ جو صرف حدیث کی بدولت وجود میں آئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایجاد کردہ علوم میں سے کوئی علم ایسا نہیں جس پر حدیث کا احسان نہ ہو۔

اقسام حدیث

حدیث صحیح: صحیح اس متصل حدیث کو کہتے ہیں جس کو صاحب العدالت اور ضابط راوی دوسرے عادل اور ضابط راوی سے روایت کرے یہاں تک کہ وہ نبیؐ یا صحابی و تابعی تک پہنچ جائے اور وہ معلل اور شاذ بھی نہ ہو۔

اقسام: صحیح حدیث کی دو اقسام ہیں۔

۱ صحیح لذاتہ ۲ صحیح لغیرہ

۱۔ صحیح لذاتہ وہ حدیث ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ کی صفات قبول کو شامل ہو۔

۲۔ صحیح لغیرہ۔ وہ حدیث کہلاتی ہے جس میں اعلیٰ صفات تو موجود نہ ہوں البتہ کسی اور وصف کی بناء پر اسکو صحیح قرار دیا جائے مثلاً حدیث حسن جب متعدد طرق سے مروی ہو تو وہ حسن کی وجہ سے ترقی کر کے حدیث صحیح کے درجہ پر فائز ہو جاتی ہے۔

حدیث صحیح کے درجات: جن احادیث کو صحیح کہا جاتا ہے ان کا مرتبہ صحت میں یکساں نہیں ہوتا اس کے علاوہ جن کتب میں صحیح احادیث کو جمع کرنے کا التزام کیا گیا ہے اس کا بھی یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان میں مندرج احادیث صحت میں مساوی الدرجہ ہیں۔ بخلاف ازیں محدثین کے نزدیک بعض حدیثیں صحیح اور بعض صحیح تر ہوتی ہیں اسی طرح بعض حدیثیں ضعیف اور بعض ضعیف تر ہوتی ہیں۔

محدثین کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ جس طرح صحت کے مقتضی اوصاف میں قوت و ضعف کے اعتبار سے درجہ بندی ہوتی ہے اسی طرح حدیث صحیح کے درجات بھی ان اوصاف کے اعتبار سے مختلف و متنوع ہوتے ہیں۔

درجات کے اسی تفاوت کے پیش نظر امام نووی نے حدیث صحیح کو سات قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ وہ متفق علیہ حدیث جو بخاری و مسلم دونوں میں موجود ہو۔

۲۔ جو حدیث صرف بخاری میں مذکور ہو۔

۳۔ وہ حدیث جو صرف مسلم نے روایت کی ہو۔

۴۔ جو حدیث بخاری و مسلم میں تو نہ ہو مگر کسی محدث نے اس حدیث کو ان دونوں کی شرط کے

مطابق روایت کیا ہو ۔

۵ ۔ جو حدیث صرف بخاری کی شرط کے مطابق ہو ۔

۶ ۔ جو حدیث صرف مسلم کی شرط کے مطابق ہو ۔

۷ ۔ وہ حدیث جس کو بخاری و مسلم کے علاوہ دیگر ائمہ حدیث نے صحیح قرار دیا ہو ۔

حدیث متواتر

متواتر اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی اتنی کثرت سے ہوں کہ عادتاً ان کا جھوٹ پر متفق ہونا ناممکن ہو۔ اور حضورؐ کا کوئی ایسا قول یا فعل بیان کریں جسے سب سے اوپر کے راوی یعنی صحابی نے اپنے کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا ہو۔

حدیث متواتر کے راویوں کی تعداد کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ یعنی ۴، ۵، ۷، ۱۰، ۱۲، ۲۰، ۴۰، ۵۰، ۷۰ اور ۳۰۰ سے کچھ زائد لیکن صحیح یہ ہے کہ حدیث متواتر کے راویوں کی تعداد معین ہیں۔

حدیث متواتر کے اقسام

حدیث متواتر کی دو بڑی قسمیں ہیں:۔

۱۔ متواتر فعلی ــــــ جس میں حضورؐ کا کوئی فعل تواتر سے بیان کیا گیا ہو۔

۲۔ متواتر قولی ــــــ جس میں حضورؐ کا کوئی قول تواتر سے بیان کیا گیا ہو۔

متواتر قولی کی پھر دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ متواتر لفظی:۔ جس میں راویوں نے حدیث کے الفاظ کو محفوظ رکھا ہو۔

۲۔ متواتر معنوی:۔ جس میں راویوں نے حدیث کے معنی کو ملحوظ رکھا ہو۔ لیکن اپنے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہو۔

اس کے بعد پھر تمام متواترات کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) سکوتی　　(۲) غیر سکوتی

۱۔ سکوتی:۔ راویوں نے حدیث کی روایت کی اور کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔

۲۔ غیر سکوتی:۔ لوگوں نے نہ صرف اس کا انکار نہیں کیا بلکہ اثبات کیا اور عمل بھی کرنے لگے۔

متواتر سے حاصل شدہ علم جمہور کے نزدیک خبر متواتر سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ جس کی حیثیت حجت کی ہے۔ نیز جمہور کے نزدیک متواتر کا منکر کافر ہوتا ہے۔

خبر متواتر کی مثال :-

احادیث میں معنوی اعتبار سے متواتر کی کمی نہیں لیکن لفظی کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ حدیث موجود ہے جبکہ بعض کا قول ہے کہ متواتر لفظی موجود نہیں جو حضرات متواتر لفظی کی موجودگی کو بیان کرتے ہیں۔ مثال میں وہ یہ احادیث پیش کرتے ہیں۔

۱۔ وہ حدیث جس میں چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔
۲۔ حدیث نبوی۔ مَنْ کَذِبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا
۳۔ مَنْ بَنیٰ لِلّٰہِ مَسْجِدًا
۴۔ وہ حدیث جس میں آپ کی شفاعت کا ذکر کیا گیا ہے۔
۵۔ وہ حدیث جس میں کھجور کے اُس تنے کے رونے کا ذکر کیا گیا ہے جس کے ساتھ سہارا لگا کر آپ خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔
۶۔ موزوں پر مسح کی حدیث۔
۷۔ واقعہ معراج۔
۸۔ وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ آپ کی انگلیوں سے پانی پھوٹنے لگا اور سب لشکر سیراب ہوگیا۔
۹۔ قتادہ کی آنکھ واپس دلانا
۱۰۔ تھوڑے سے کھانے سے سب لشکر کو شکم سیر کرنا۔

خبر احاد

جو احادیث تواتر کے درجے کو نہ پہنچیں انہیں آحاد کہتے ہیں۔ اخبار آحاد کی تین قسمیں ہیں :-

۱۔ مشہور یا مستفیض۔
۲۔ عزیز
۳۔ غریب

مشہور یا مستفیض کو بعض حضرات نے ایک ہی قسم شمار کیا ہے لیکن دراصل ان دونوں میں فرق ہے۔ جس حدیث کے ہر زمانے میں کم از کم تین راوی ہوں اُسے

مستفیض کہتے ہیں، جو اپنے اصل کے اعتبار سے آحاد ہوں اور بعد کے زمانے میں تواتر کی حد تک پہنچ جائے اسے حدیث 'مشہور' کہتے ہیں۔ یعنی

جس حدیث کو تین یا زیادہ نے روایت کیا ہو لیکن قرن اوّل (زمانۂ صحابہ چوبعثت نبوی سے تقریباً ۱۱۰ھ تک ہے) میں وہ متواتر نہ ہوئی ہو بلکہ دوسرے (زمانۂ تابعین جو تقریباً ۱۷۰ھ تک ہے) میں متواتر ہوئی ہو وہ مشہور بھی ہوگی اور مستفیض بھی۔

(۱) جسے ہر زمانے میں تین یا تین سے زیادہ نے روایت کیا ہو لیکن دوسرے یا تیسرے قرن میں تواتر کو پہنچ گئی ہو تو وہ مشہور ہوگئی، متواتر نہ ہوگی۔

احناف میں سے شیخ ابوبکر جصاص مشہور کو بھی متواتر ہی کی ایک قسم جانتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک متواتر کی دو قسمیں ہیں :۔

۱۔ جو ابتدا سے انتہا تک متواتر ہو۔

۲۔ جو ابتداً متواتر نہ ہو صرف انتہاً متواتر ہو۔

پہلی قسم کو وہ متواتر اور دوسری کو مشہور کہتے ہیں۔

حدیث عزیز

حدیث عزیز اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو کم از کم دو راوی بیان کرتے ہوں ایسی حدیث کو یا تو نادر الوجود ہونے کی وجہ سے عزیز کہتے ہیں یا اس لئے کہ ایک کے بجائے دو راوی ہونے کی بنا پر وہ عزیز یعنی قوی ہو جاتی ہے۔

غریب

جس حدیث کے سلسلہ سند میں کسی زمانہ میں صرف ایک ہی ثقہ راوی ہو غریب کہلاتی ہے، اس کی غرابت کبھی حدیث کے متن میں ہوتی ہے اور کبھی سند میں۔ غریب کو فرد بھی کہتے ہیں۔ فرد کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) فرد مطلق۔ (۲) فرد نسبی۔

فرد مطلق وہ حدیث ہے جس میں صحابی سے صرف ایک راوی روایت کرے۔

فرد نسبی وہ حدیث ہے جس کو کسی صحابی سے صرف ایک راوی نے روایت کیا ہو۔ پھر اس راوی سے بھی ایک راوی روایت کرے اگر اس کے بعد بھی راوی کا سلسلہ ایک ایک کا چلتا رہے پھر بھی اسے فرد نسبی ہی کہیں گے۔

بقول حافظ ابن حجرؒ محدثین کی عادت یہ ہے کہ جب وہ کسی حدیث کو فرد کہتے

ہیں تو اس سے فرد مطلق مراد لیتے ہیں اور جب غریب کہتے ہیں تو اس سے فرد نسبی مراد لیتے ہیں۔

خبرِ واحد سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے

بلا اختلاف محدثین کے نزدیک متواتر لفظی یا معنوی دونوں سے قطعی علم حاصل ہوتا ہے البتہ یہ امر مختلف فیہ ہے کہ صحیح خبر واحد سے ظنی علم حاصل ہوتا ہے یا یقینی۔ امام نوویؒ کے مطابق چونکہ خبر واحد ظنی الثبوت ہوتی ہے اس لئے علم بھی ظنی حاصل ہوتا ہے۔ اکثر محدثین کی یہ رائے ہے کہ خبر واحد اگر بخاری و مسلم کی روایت کردہ ہو تو اس سے قطعی علم حاصل ہوتا ہے۔ بعض علماء نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ خبر واحد اگر صحیح ہو تو خواہ اسے شیخین (بخاری و مسلم) نے روایت کیا ہو یا دیگر محدثین نے وہ حدیث متواتر کی طرح یقینی علم کا دیتی ہے۔ امام ابن حزم فرماتے ہیں،۔

ایک صاحب العدالت راوی جب دیگر اصحاب عدالت سے روایت کرتا ہو تو ایسی حدیث واجب العلم والعمل ہوتی ہے۔

حدیث حسن

حدیث حسن وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو اور جس کا راوی صاحب العدالت مگر قلیل الضبط ہو اور شذوذ اور علت بھی نہ ہو۔

حدیث حسن کی دو قسمیں ہیں۔

حسن لذاتہ۔ حسن لغیرہ

اس میں جو خوبی پائی جاتی ہے وہ اس کی ذاتی ہے کسی خارجی سبب کی بنا پر نہیں اس میں حدیث صحیح کے سب شرائط پائے جاتے ہیں البتہ اس کے رُوَاۃ و رِجال میں ضبط کی کمی پائی جائی ہے۔

جب کسی قید و شرط کے بغیر حدیث حسن کہا جائے تو اس سے "حَسَنٌ لِذَاتِہٖ" مراد ہوتی ہے۔

حَسَن لغیرہ وہ حدیث ہے جس کی سند میں ایسا مستور راوی ہوتا ہے جس کی صلاحیت اور عدم صلاحیت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا البتہ وہ زیادہ غفلت پیشہ، کثیر الخطا اور مُتَّہم بالکتاب نہیں ہوتا۔ نیز کسی دوسری حدیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے

حدیث مقبول (حدیث صحیح و حسن) کو مندرہ ذیل القاب سے بھی ملقب کیا جاتا ہے۔

جَیِّد۔ مجوّد۔ قوی۔ ثابت۔ محفوظ۔ معروف۔ صالح۔ مُستحسَن۔

حدیث ضعیف

ضعیف حدیث وہ ہے جس میں حدیث صحیح وحسن کی صفات نہ پائی جاتی ہوں
عمل کے اعتبار سے ضعیف کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ وہ ضعیف حدیث جس پر عمل جائز ہوتا ہے یہ امام ترمذی کی اصطلاح حدیث حسن سے ملتی جلتی ہے۔

۲۔ وہ ضعیف حدیث جس پر عمل جائز نہیں اور جس کو واہی (بیکار) بھی کہتے ہیں۔

حدیث ضعیف کے اقسام

تعریف:۔ مُرسَل، وہ حدیث ہے جس سے صحابی کا نام ساقط ہو گیا ہو۔
مثال:۔ نافع کہتے ہیں۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَذَا اَوْ فَعَلَ کَذَا اَوْ فَعَلَ بِحَضْرَتِہٖ کَذَا (آپ نے یوں فرمایا۔ یا یوں کیا یا آپ کی موجودگی میں اس طرح کیا گیا۔)

حالانکہ نافع تابعی کہتے ہیں۔ گویا اس حدیث میں صحابی کا نام مذکور ہی نہیں، اس اعتبار سے مُرسَل حدیث مرفوع تابعی ہوتی ہے۔ خواہ تابعی چھوٹی عمر کا ہو یا بڑی عمر کا۔

اس حدیث کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اتصال نہیں ہوتا۔

حدیث مرسل حجت نہیں

حدیث مُرسل دین میں حجت نہیں۔ حدیث نبوی کے حُفّاظ اور نقّاد کی آخری وحتمی رائے یہی ہے امام مسلم مقدمۂ صحیح مسلم میں فرماتے ہیں۔
"ہمارے اور محدثین کے قول کے مطابق مرسل حجت نہیں ہے۔"

حدیث مرسل کے درجات

سب سے اعلیٰ مرسل حدیث وہ ہے جس کو ایسا صحابی مُرسل بیان کرے جس کا سماع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

۲۔ اس کے بعد اس صحابی کی مرسل کا درجہ ہے جس نے آپ کو دیکھا اگر

سماع ثابت نہ ہو۔

۳۔ مُخَضرَم صحابی کی مرسل روایات (وہ صحابی جس نے کفر واسلام کے دونوں زمانے دیکھے ہوں۔

۴۔ ثقہ تابعین۔ مثلاً سعید بن المسیب کی روایات۔

۵۔ ان راویوں کی روایات جو ایسے اساتذہ وشیوخ کا انتخاب بڑی سوچ وبچار کے بعد کرتے ہیں مثلاً شعبی اور مجاہد۔

۶۔ ان راویوں کی مرسل روایات جو ہر کسی سے روایات اخذ کرتے ہوں مثلاً حسن بصری۔

منقطع

تعریف:۔ منقطع وہ حدیث ہے جس کی سند سے کوئی راوی ساقط ہو یا اس میں کوئی مبہم راوی ذکر کیا گیا ہو۔

حدیث منقطع اس لئے ضعیف ہوتی ہے کہ اس کی سند متصل نہیں ہوتی، گویا اس اعتبار سے یہ حدیث مرسل کی طرح ہوتی ہے۔

مثال:۔

وہ حدیث ہے جسے عبدالرزاق نے ثوری سے انہوں نے ابو اسحاق سے انہوں نے زید سے اور انہوں نے حذیفہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ آپ نے فرمایا "اگر تم ابو بکر کو خلیفہ بناؤ تو وہ قوی بھی ہے اور امانت دار بھی"

اس حدیث کی اسناد میں ثوری اور ابو اسحاق کے درمیان ایک راوی شریک نامی رہ گیا ہے اس لئے کہ ثوری نے براہ راست ابو اسحاق سے نہیں سنا بلکہ شریک سے سنا اور شریک نے یہ حدیث ابو اسحاق سے سُنی۔

معضل

تعریف:۔ معضل اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں دو یا دو سے زیادہ راوی پے درپے ساقط ہو گئے ہوں۔

معضل کی پہچان منقطع سے بھی زیادہ دشوار ہے کیونکہ منقطع کی نسبت اس میں زیادہ اخفاء وابہام پایا جاتا ہے اسی لئے اس کو معضل (دشوار۔ مشکل) کہتے ہیں۔

مثال:۔ اعمش شعبی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا "آدمی سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ تو نے فلاں فلاں کام کئے؟ وہ کہے گا نہیں۔ پھر اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی۔

یہ روایت اس لئے معضل ہے کہ شعبی نے انس سے روایت کی اور انس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ تو گویا اعمش نے انس اور نبی کریم کو سند سے ساقط کرکے حدیث کو معضل بنا دیا۔

مُدَلَّس

حدیث مدلس کی دو قسمیں ہیں

ا۔ مدلس الاسناد

تعریف۔ یہ وہ حدیث جو راوی ایسے شخص سے روایت کرے جو اس کا ہم عصر ہو اور اس سے مل چکا ہو مگر اس سے اس کا سماع ثابت نہ ہو یا ایسے ہم عصر سے روایت کرے جسے ملا نہ ہو۔ مگر دوسرے کو یہ تاثر دے کہ اس نے اپنے معاصر سے سُن کر یہ روایت بیان کی ہے۔

مثال:۔ اس کی مثال علی بن خسرم کا یہ قول ہے۔

"ہم سفیان بن عیینہ کے یہاں حاضر تھے۔ سفیان نے کہا" زہری نے یوں فرمایا" سفیان سے پوچھا گیا" کیا آپ نے زہری سے سنا ہے"۔ سفیان نے کہا" مجھے عبدالرزاق نے سنایا۔ اس نے معمر سے سنا اور معمر نے زہری سے سنا"

مذکورہ روایت میں سفیان، زہری کے ہم عصر تھے اور ان سے مل چکے تھے۔ مگر انھوں نے زہری سے کوئی روایت نہیں سنی بخلاف ازیں سفیان نے روایت عبدالرزاق سے سنی عبدالرزاق نے معمر سے اور معمر نے زہری سے اخذ کی۔

اس سند میں تدلیس یہ ہے کہ سفیان عبدالرزاق اور معمر دونوں کا نام حذف کر دیا اور ایسے الفاظ سے روایت کی جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ انہوں نے براہِ راست یہ حدیث زہری سے سنی۔

یہ تدلیس کی نہایت بدترین قسم ہے اور صریح دروغ گوئی پر مبنی ہے۔ شعبہ فرماتے ہیں "تدلیس جھوٹ کا بھائی ہے"۔

جوزادی ایک دفعہ تدلیس کا ارتکاب کرتا تو امام شافعی اس کی روایت کو رَد کر دیتے مگر اکثر علماء کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ جو راوی تدلیس کی جانب منسوب ہے وہ جس روایت میں سماع کی تصریح کرے وہ روایت قبول کی جائے گی اور جو روایت مبہم ہو گی اس کو رَد کر دیا جائے گا۔

۲۔ تدلیس الشیوخ

تعریف۔ راوی بڑھا چڑھا کر اپنے شیخ کے القاب بیان کرے یا کنیت کے بغیر اس کا نام ذکر کرے اور مقصد یہ ہو کہ اس کی پہچان نہ ہو سکے۔ مثلاً یوں کہے:۔

"یہ حدیث مجھے فلاں علامہ امام ضابط اور حافظ نے سنائی۔

مثال:۔ وہ حدیث جو ابو بکر بن ہ المغربی نے ابو بکر بن ابی داؤد سے روایت کی اس نے کہا کہ مجھے عبداللہ بن ابی عبداللہ نے حدیث سنائی اس نے ابو بکر محمد بن حسن نقاش مفسر سے سنا اس نے کہا ہمیں محمد بن سند نے بتایا۔

+س سند میں راوی کے والد کے بجائے اس کی نسبت اس کے دادا کی طرف کر دی گئی حالانکہ اس کی نسبت والد کی جانب مشہور تر ہے۔

تدلیس العطف

بعض علماء نے تدلیس کو متعدد قسموں میں تقسیم کر دیا ہے جن میں سے ایک تدلیس العطف بھی ہے مثلاً راوی کہے حدثنا فلاں وفلاں۔ حالانکہ اس نے اس دوسرے شخص سے کچھ بھی نہ سنا ہو جس کا تذکرہ واؤ عطف کے بعد بقوت معطوف کرتا ہے

تدلیس السکوت

تدلیس السکوت کا مطلب یہ ہے کہ راوی کہے سمعت یا حدثنا یا حدثنی اس کے بعد تھوڑی دیر خاموش رہے پھر کہے اعمش اس سے سننے والا یہ تاثر لے گا کہ اس نے اعمش سے سنا حالانکہ یہ درست نہیں۔

تدلیس تسویہ

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس راوی کے شیخ کا نام اس لئے ذکر نہ کیا جائے کہ وہ ضعیف یا صغیر السن ہے۔ اس کے بجائے یہ ظاہر کیا جائے کہ حدیث صرف ثقات سے مروی ہے تاکہ اسے صحیح اور مقبول قرار دیا جائے یہ تدلیس کی بدترین قسم ہے کیونکہ اس

میں شدید ترین دھوکا پایا جاتا ہے۔

تدلیس البلاد:۔ بعض مدلسین اپنے شیخ کی تعظیم کے لئے ایک مبہم اور متشابہ لفظ بولتے ہیں اور اس طرح کسی شہر یا قبیلہ کی عظمت وفضیلت کے پردہ میں شیخ کی عظمت جتانا چاہتے ہیں۔ مثلاً ایک مصری شخص کہے کہ حدثنی فلان بالاندلس (مجھے اندلس کے فلاں شخص نے حدیث سنائی) اور اندلس سے مراد مقام ہو جو القرافہ میں واقع ہے یا زقاق حلب کہے اور قاہرہ کی ایک جگہ مراد ہے۔

تدلیس اور مرسل خفی

تدلیس کی اصطلاح اس راوی کے ساتھ مختص ہے جو ایسے شخص سے روایت کرے جس کے ساتھ اس کی ملاقات عام طور پر معروف ہے اور وہ شخص اس کا ہم عصر ہو اور اس کی ملاقات اسکے ساتھ مشہور نہ ہو تو اسے مرسل خفی کہتے ہیں۔

خطیب بغدادی مدلس اور مرسل کے درمیان فرق وامتیاز کے سلسلہ میں فرماتے ہیں "اگر راوی یہ بیان کر دے کہ جس شیخ کا نام اس نے ذکر کیا ہے اس نے اس سے حدیث نہیں سنی تو اس کی وضاحت کے بعد وہ اس ارسال کرنے والا ہو گا مدلس نہیں ہو گا اس لئے کہ ارسال کرنے والا سامع کو یہ تاثر نہیں دیتا کہ اس نے سنا ہے حالانکہ اس نے سنا نہیں ہوتا البتہ جس تدلیس کا ذکر ہم نے کیا ہے وہ لامحالہ ارسال پر مشتمل ہوتی ہے اسلئے کہ مدلس اس شخص کا ذکر کرنا نہیں چاہتا جس سے وہ تدلیس کرتا ہے۔ مدلس اور مرسل کے درمیان فرق یہ ہے کہ مدلس سامع کو اس بات کا تاثر دیتا ہے کہ اس نے سنا ہے حالانکہ اس نے سنا نہیں ہوتا اس لئے یہ مدلس ارسال کو متضمن ہے۔ البتہ ارسال تدلیس کو شامل نہیں ہے کیونکہ ارسال میں سامع کو اس وہم میں مبتلا نہیں ہوتا کہ اس نے سنا ہے حالانکہ سنا نہیں ہوتا اسی لئے علماء ارسال کرنے والے کی مذمت نہیں کرتے مگر مدلس کو ناپسند کرتے ہیں۔

معلل

معلل اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں کسی ایسی علت کا پتہ چلے جس سے حدیث میں قدح وارد ہو جاتی ہو اگرچہ بظاہر وہ حدیث علل سے سالم نظر آتی ہو۔

حدیث کی علت معلوم کرنے کے لئے وسعت علم، قوت حافظہ اور فہم دقیق

کی ضرورت ہے اس لئے کہ علت ایک پوشیدہ چیز ہے جس کا پتہ بسا اوقات علوم حدیث میں مہارت رکھنے والوں کو بھی نہیں چلتا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

یہ حدیث کے نہایت دقیق اور مشکل علوم میں سے ہے علت کی پہچان میں صرف وہی شخص ماہر ہو سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے روشن دماغی، قوت حافظہ، مراتب رواۃ کی پہچان اور اسانید و فنون میں مہارت تامہ سے نوازا ہے۔

مضطرب

تعریف۔ جس حدیث کی متعدد روایات ہوں اور تعداد کے باوجود ان میں اس طرح کی مساوات پائی جاتی ہو کہ کسی طرح بھی ایک روایت کو دوسری کے مقابلہ میں ترجیح نہ دی جا سکتی ہو۔ بعض اوقات ایک ہی راوی اس حدیث کو دو یا دو سے زیادہ مرتبہ روایت کرتا ہو یا دو سے زیادہ راوی اس کو روایت کرتے ہوں

مقلوب

تعریف۔ ایسی حدیث جس میں کسی راوی سے متن حدیث کا کوئی لفظ یا سند یا کسی راوی کا نام و نسب بدل گیا یا مقدم کو مؤخر یا مؤخر کو مقدم کیا گیا یا ایک چیز کی جگہ دوسری رکھ دیا گیا ہو۔

اس تعریف سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قلب سند و متن دونوں میں پایا جاتا ہے۔

مثال۔

مقلوب فی المتن کی مثال صحیح مسلم کی وہ روایت ہے جس میں ان سات آدمیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو روز قیامت سایہ خداوندی کے نیچے ہوں گے اس حدیث میں مذکور ہے کہ "وہ آدمی جس نے پوشیدہ صدقہ دیا حتیٰ کہ اس کا بایاں ہاتھ جو خرچ کرتا ہے دائیں ہاتھ کو بھی اس کا پتہ نہیں چلتا۔

حدیث صحیح کے الفاظ یوں ہیں۔

اس کا دایاں ہاتھ جو خرچ کرتا ہے بائیں کو اس کا پتہ نہیں چلتا۔

شاذ

تعریف وہ حدیث ہے جس میں ایک ثقہ راوی دوسرے ثقہ راوی کی مخالفت کرتا ہو۔ یا وہ حدیث جس میں ایک مقبول راوی اپنے سے افضل راوی کی مخالفت کر رہا ہو۔

مندرجہ بالا تعریفوں سے بہتر تعریف ہو سکتی ہے۔

شاذ سے وہ حدیث مراد ہے جس میں ایک مقبول راوی کی مخالفت کر رہا ہو

امام شافعی کے نزدیک شاذ کی تعریف یہ ہے۔ حدیث شاذ وہ ہے جس میں ایک ثقہ راوی دوسرے ثقہ راویوں کی مخالفت کرتا ہے۔

امام ابن قیم شاذ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

حدیث شاذ سے مراد یہ ہے کہ ایک راوی دوسرے ثقہ راویوں کی مخالفت کرے جب ثقہ راوی ایک منفرد روایت بیان کرے اور ثقہ راویوں اس کی مخالفت نہ کی ہو تو اس کو شاذ نہیں کہتے اور اگر ایسی حدیث کو شاذ کہا بھی جائے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ اصطلاح اس سے ناقابل قبول ہو جائیگی۔

امام حاکم فرماتے ہیں

حدیث شاذ وہ ہے جس کے روایت کرنے میں ایک ثقہ راوی منفرد ہو اور اس کی تائید دوسری کسی روایت سے نہ ہوتی ہو۔

منکر

تعریف۔ منکر اس حدیث کو کہتے جس کو ضعیف راوی ثقہ راوی کی مخالفت کرتے ہوئے بیان کرتا ہے۔

متروک

متروک اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی پر حدیث میں دروغ گوئی یا کسی قول و فعل کی وجہ سے فسق کا الزام عائد کیا گیا ہو۔

مرفوع

مرفوع اس قول و فعل یا تقریر کو کہتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہو خواہ اس کی نسبت آپ کی طرف صحابی نے کی ہو یا تابعی نے یا کسی اور نے اور خواہ اس کی سند متصل ہو یا نہ ہو۔

مذکور بالا تعریف سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حدیث مرفوع ہمیشہ متصل ہی نہیں ہوتی بلکہ جب اس کی سند سے صحابی کا نام ساقط ہو جائے تو مرسل ہو جاتی ہے یا کسی اور راوی کا نام رہ جائے یا کسی مبہم شخص کا نام ذکر کر دیا جائے تو منقطع ہو جاتی ہے اور اگر

وہ یا دو سے زیادہ راویوں کے نام ساقط ہو جائیں تو منقطع ہو جاتی ہے اور ان تینوں حالتوں مرسل، منقطع، معضل میں مرفوع ہونے کے باوجود ضعیف قرار دی جاتی ہے۔

مرفوع کی تین اقسام ہیں۔ مرفوع قولی۔ مرفوع فعلی اور مرفوع تقریری۔

مرفوع قولی

مرفوع قولی کی مثال یہ ہے کہ صحابی کہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے یا آپ نے مجھے یہ حدیث سنائی یا آپ سے مروی ہے کہ آپ نے اس طرح فرمایا وغیرہ

مرفوع فعلی

مثلاً صحابی یوں کہے کہ میں نے آپ کو یوں کرتے دیکھا یا کسی اور نے مجھے بتایا کہ آپ اس طرح کیا کرتے تھے۔

مرفوع تقریری

اس کی مثال یہ ہے کہ صحابی یوں کہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یوں کیا یا کسی نے کہا کہ فلاں شخص نے آپ کے سامنے اس طرح کیا اور آپ اس پر اعتراض نہیں فرمایا۔

حدیث مرفوع میں صرف متن کو دیکھا جاتا ہے، سند کو نہیں۔ اس لئے جو حدیث بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہوگی اس کو مرفوع کہیں گے۔ قول و فعل اور تقریر تینوں کو متن حدیث کہا جاتا ہے۔

موقوف

صحابی کے قول، فعل یا تقریر کو موقوف کہتے ہیں۔ مثلاً راوی یوں کہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے یوں کہا یا حضرت علی نے یوں کیا یا حضرت ابو بکر کے سامنے فلاں کام کیا گیا اور آپ نے منع فرمایا۔

مقطوع

تابعی کے قول، فعل یا تقریر کو مقطوع کہتے ہیں۔

مسند

ایسی حدیث جس کی سند راوی سے لے کر آخر تک متصل ہو اور درمیان میں کوئی کڑی

توڑ ہوئی نہ ہو اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔

خطیب بغدادی فرماتے ہیں:۔

کسی حدیث کو مسند کہنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ راوی سے لیکر منتہیٰ تک متصل ہو مگر مسند کا اطلاق زیادہ تر اسی حدیث پر کیا جاتا ہے جو مرفوع ہو اور نبی کریم تک پہنچی ہو۔ اتصالِ سند کا مطلب یہ ہے کہ اس کے راوی نے نیچے والے راوی سے وہ حدیث سنی ہو یہاں تک کہ وہ آخر تک پہنچ جائے اگر چہ اس میں صراحتہً سماع کا ذکر نہ ہو بلکہ صرف عن کیساتھ روایت کی گئی ہو۔

امام حاکم کی رائے یہ ہے کہ مسند کا اطلاق ہمیشہ مرفوع متصل حدیث پر کیا جاتا ہے ان کے نزدیک حدیث مسند کی شرط یہ ہے کہ موقوف مرسل اور معضل نہ ہو اور اس کی سند میں کوئی مدلس راوی نہ ہو اور یہ فرماتے ہیں کہ

حدیث مسند میں اس قسم کے الفاظ نہیں ہونے چاہئیں مثلاً اخبرت عن فلان یا حدثت عن فلان یا بلغنی عن فلان یا رفعہ فلان یا اظنہ مرفوعاً اس لئے ان الفاظ سے اس کا اتصال قائم نہیں رہتا اور اس میں فساد رونما ہو جاتا ہے۔

متصل یا موصول

ایسی حدیث جس کی سند متصل ہو خواہ وہ حدیث مرفوع ہو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہو یا صحابی کی موقوف روایت ہو یا تابعی کی مقطوع روایت ہو متصل یا موصول کہلاتی ہے

معنعن

اس روایت کو کہتے ہیں جس میں فلاں عن فلاں کے الفاظ سے روایت کی گئی ہو اور سماع حدیث کا ذکر صراحتہً نہ کیا گیا ہو۔

مذہب راجح کے مطابق روایت معنعن کو متصل قرار دیا جائے گا بشرطیکہ اس میں یہ شرائط پائے جاتے ہوں۔

۱۔ راوی کی عدالت۔

۲۔ راوی اپنے استاد سے مل چکا ہو۔

۳۔ روایت میں تدلیس (استاد کو چھپانا) کا عیب نہ پایا جاتا ہو۔

مدلس

حدیث مدلس وہ ہے جس کی سند میں حدثنا فلان ان فلانًا کے الفاظ ہوں امام مالک ایسی روایات کو حدیث معنعن کی طرح خیال کرتے ہیں۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ عن فلان اور ان فلانًا قال کذا میں کیا فرق ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ دونوں ہی مساوی ہیں۔

معلق

معلق اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند کے آغاز سے ایک یا ایک سے زیادہ راوی ترتیب وار محذوف ہوں اور حدیث کو ان راویوں کی طرف منسوب کیا گیا ہو جو محذوف راویوں کے اوپر ہوں۔

عالی

عالی کی اقسام ہیں۔ (۱) سند عالی مطلق (۲) سند عالی نسبی واضافی۔

سند عالی مطلق

وہ ہے جس کے راوی قلت تعداد کے باعث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہوں اور اس حدیث کی کسی دوسری سند میں راویوں کی تعداد اس سے زیادہ ہو۔

ایسی سند عالی کو اجل الاسانید تصور کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ سند صحیح اور پاکیزہ ہو اگر ضعیف ہو تو اسے ناقابل التفات قرار دیا جائے گا خصوصًا جبکہ اس میں پچھلے زمانے کے ایسے جھوٹے راوی بھی موجود ہوں جو صحابہ سے سماع کے دعوے دار تھے۔ مثلاً

ابن ہدبہ۔ دینار۔ خراشہ۔ نعیم ابن سالم۔ ابی الدنیا۔

اس لئے حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔

جب کسی محدث کو دیکھو کہ ایسے راویوں کو سند عالی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ جاہل آدمی ہے۔

سند عالی نسبی

وہ سند ہے جس کے راوی کسی امام حدیث سے قریب تر ہوں مثلاً اعمش۔ ابن جریج۔ مالک۔ شعبہ اور دیگر ائمہ حدیث۔

اس کے ساتھ ساتھ سند صحیح بھی ہو یا اس سند کے راوی معتبر کتب حدیث سے کسی کتاب سے قریب تر ہوں مثلاً صحاح ستہ۔ موطا امام مالک اور دیگر کتب اس کو نسبی اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں جو علو سند پایا جاتا ہے وہ حقیقی نہیں بلکہ نسبی اور اضافی ہوتا ہے۔

سند عالی نسبی کی متعدد صورتیں ہیں۔ مشہور ترین صورت یہ ہے کہ بخاری کی روایت کردہ ایک حدیث کو لے کر کسی دوسری سند سے اس طرح روایت کی جائے کہ وہ امام بخاری کے شیخ یا شیخ الشیخ تک پہنچ جائے اور اس سند میں بخاری کی سند کے مقابلہ میں راویوں کی تعداد کم ہو۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے سند عالی نسبی کو چار قسموں میں منقسم کیا ہے:

(۱) موافقت (۲) بدل (۳) مساواہ (۴) مصافحہ

۱۔ موافقت

موافقت کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کی کسی کتاب کے مؤلف کے شیخ تک کسی دوسری سند سے پہنچ جائیں۔ مثلاً امام بخاری ایک حدیث قتیبہ سے اور وہ مالک سے روایت کرتے ہیں کوئی دوسرا شخص کسی اور سند سے یہی روایت قتیبہ سے بیان کرے اور اس سند میں امام بخاری کی نسبت راویوں کی تعداد کم ہو۔

بدل

اگر کوئی شخص مؤلف کتاب کے شیخ الشیخ تک کسی اور سند سے پہنچ جائے تو اس کو بدل کہتے ہیں۔ مثلاً سند مذکورہ بالا کو کوئی شخص ایک اور سند سے قعنبی از مالک روایت کرے تو اس صورت میں قعنبی گویا قتیبہ کا بدل ہوگا۔

مساواۃ

مساواہ کا مطلب ہے کہ مؤلف کتاب نے ایک حدیث کو ایک خاص سند سے روایت کیا ہو۔ ایک دوسرا شخص کسی دوسری سند سے یہ حدیث بیان کرے اور دونوں میں راویوں کی تعداد برابر ہو اس کی مثال بقول ابن حجر یہ ہے کہ فرض کیجئے امام نسائی ایک حدیث روایت کرتے ہیں اور اس کی سند میں ان سے لیکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک گیارہ راوی ہوں۔ ہم یہی حدیث کسی اور سند سے بیان

کریں اور اس میں بھی اتنے ہی راوی ہوں تو گویا ہم اس صورت میں امام نسائی کے مساوی ہوں گے اگرچہ ان کی سند ہماری سند سے الگ ہے۔

۴۔ مصافحہ

مصنف کتاب کے تلمیذ کے ساتھ مساوات کو مصافحہ کہتے ہیں۔ مصافحہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب دو آدمی ملتے ہیں تو وہ باہم مصافحہ کرتے ہیں۔ اگر تلمیذ مصنف نے ہمارے شیخ کی برابری کی ہو تو گویا تم نے مصنف کتاب سے مصافحہ کیا اور ان سے روایت کی اور اگر مساوات تمہارے شیخ الشیخ کے ساتھ ہوگی تو مصافحہ کرنے والا تمہارا الشیخ ہوگا اور اگر مساوات تمہارے شیخ کے شیخ الشیخ کے ساتھ ہوئی تو مصافحہ کرنے والا تمہارا الشیخ الشیخ ہوا۔

متابع

وہ حدیث ہے جس کے راوی کی دوسرا راوی تائید کرتا ہو اور تائید کرنے والا اس قابل ہو کہ اس کی روایت تسلیم کی جا سکے۔ تائید کرنے والا پہلے راوی کے شیخ یا شیخ الشیخ سے ایسے الفاظ میں روایت کرے جو پہلے راوی کے بیان کردہ الفاظ سے ملتے جلتے ہوں۔

متابع کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) متابع تام (۲) متابع قاصر۔

متابع تام۔ وہ ہے جس میں ایک راوی دوسرے راوی کی تائید کرتا ہو۔

متابع قاصر۔ وہ ہے جو راوی کے شیخ یا شیخ الشیخ کی تائید کرتا ہو۔

شاہد

اس کی تعریف یہ ہے کہ دوسرا راوی یوں تو اس کے راوی کی تائید کرتا ہو مگر وہ مختلف صحابی سے روایت کرتا ہو اور اس کی یہ روایت لفظ و معنی دونوں میں یا صرف معنی میں پہلے راوی کی روایت سے ملتی جلتی ہو۔

شاہد کی دو اقسام ہیں:۔ (۱) شاہد لفظی (۲) شاہد معنوی

شاہد لفظی:۔ جو متن حدیث کی لفظاً تائید کرے اس کو شاہد لفظی کہتے ہیں۔

شاہد معنوی:۔ جو کسی حدیث کے معنی و مفہوم کی تائید کرے اسے شاہد معنوی کہتے ہیں

مُدْرَج

مدرج اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند یا متن میں ایسے اضافہ کا پتہ چلے جو دراصل اس میں نہ ہو۔

اِدراج ایک چیز کو دوسری کے اندر داخل کرنے اور اس کے سمونے کو کہتے ہیں۔

سمنانی فرماتے ہیں:۔

جو شخص دانستہ ادراج کا مرتکب ہوتا ہے وہ ساقط العدالت ہے اور ان لوگوں میں شمار ہوتا ہے جو کلمات کی تعریف کرتے ہیں وہ کذّابین کے زمرہ میں شامل ہے[1]

مسلسل

مسلسل وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو۔ تدلیس سے پاک ہو اور جس کی روایت میں ایک خاص عبارت یا فعل کی تکرار ہوئی ہو اور ہر راوی اوپر والے راوی سے اس فعل یا عبارت کو نقل کرتا ہے یہاں تک کہ وہ سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے

اَلمُصَحَّف

جس میں نقطوں کی تبدیلی کر کے ایک حرف یا چند حروف کو بگاڑ دیا گیا ہو۔ مگر اس کی ظاہری صورت میں کوئی فرق نہ آیا ہو تو اس کو مصحف کہتے ہیں بخلاف ازیں اگر حرف کی شکل تبدیل ہو گئی تو اس کو **محرف** کہتے ہیں۔

موضوع

موضوع اصل میں کوئی حدیث نہیں ہوتی بلکہ واضع کوئی جھوٹی سند گھڑ کر کوئی حکیمانہ مقولہ یا کوئی جامع کلمہ یا مختصر ضرب المثل منسوب کر دیتے ہیں۔ چونکہ جب تک ان کو وضع شدہ ثابت نہ کر دیا جائے تو یہ حدیث ہی کہلاتی ہیں اس لئے اس کو بھی آسانی کے لئے حدیث ہی کی قسم شمار کرتے ہیں۔

موضوع اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو کوئی کذاب گھڑ کر جھوٹ موٹ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دے۔

علمائے کرام نے احادیث صحیحہ کو موضوعات سے نکھرنے اور ان میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے اصول وضوابط اور بہت سخت قسم کا مقیاس ومعیار

وضع کیا تھا۔ یوں تو یہ قواعد بہت ہیں مگر مندرجہ ذیل پانچ ضوابط کسی حدیث کے متعلق وضع کا فیصلہ کرنے کے کافی ہیں،

۱۔ واضع خود اس کا اعتراف کرے کہ اس نے یہ حدیثیں وضع کی ہیں۔

۲۔ حدیث کے معنی و مفہوم میں کوئی خرابی ہو یا اس کا اعراب نحوی اعتبار سے غلط ہو۔ ایسی حدیث اس لئے موضوع ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب تھے ایسی غلطی آپ سے صادر نہیں ہو سکتی۔

۳۔ حدیث عقل انسانی یا حس و مشاہدہ کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

۴۔ حدیث میں معمولی سی بات پر بہت زیادہ اجر و ثواب کا وعدہ دیا گیا ہو۔ یا معمولی سی بات پر شدید سزا کی دھمکی دی گئی ہو۔

۵۔ حدیث کا واضع دروغ گو اور بے دین آدمی ہو اور اپنے نظریات کی تائید میں حدیثیں گھڑنے میں کوئی باک نہ سمجھتا ہو۔

صحاح ستہ

صحاح ستہ سے مراد احادیث کی وہ چھ صحیح اور مستند کتابیں ہیں جن کے بارے میں علمائے امت کی اکثریت اس بارے میں متفق ہے کہ ان میں مذکورہ احادیث زیادہ ترصحیح ھیں۔

ان چھ کتب اور ان کے مؤلفین پر ملا جلا تاثر پیش کیا جارہا ہے۔

صحیح بخاری و امام بخاریؒ

تعارف امام بخاری، بخارا کے مشہور علماء کرام میں سے ہیں۔ آپ کے والد کا نام اسمٰعیلؒ ہے۔ آپ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ آپ کے والد کے تقویٰ کا یہ حال تھا کہ انہوں نے وفات کے وقت فرمایا "میرے مال میں ایک درہم بھی مشتبہ اور مالِ حرام سے نہیں"

امام صاحب نے اپنی والدہ کی زیر تربیت پرورش پائی۔ آپ بچپن ہی میں نابینا ہو گئے تھے۔ آپ کی والدہ نے رو رو کر دعائیں مانگیں چنانچہ خواب میں حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا "تیری دعا قبول ہو گئی" صبح دیکھا تو امام صاحب کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ آپ نے دس برس کی عمر میں حدیث یاد کرنی شروع کی اور گیارھویں سال میں اپنے شیخ کی غلطی پکڑی سترہ برس کی عمر میں والدہ کے ہمراہ حج پر گئے اور بعد ازاں حصولِ علم کے لئے وہیں مقیم ہو گئے۔

امام صاحب نے ۱۸ سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کے سامنے بیٹھ کر تاریخ کبیر تالیف کی۔

سماعت حدیث کے لئے اسلامی ممالک کے متعدد سفر کئے۔ آپ نے مصر، شام کا، دو دفعہ بصرہ کا چار دفعہ اور حجاز چھ دفعہ حصولِ حدیث کے لئے سفر کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اسّی ہزار اشخاص سے روایت کی ہے جو سب اصحاب حدیث سے تھے۔ آپ نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر کسی کو دس لاکھ حدیثیں یاد ہوں تو اس میں تعجب

کی کیا بات ہے۔

امام بخاری اور صحیح بخاری امام صاحب نے ۱۸ سال کی عمر میں بخاری شریف کی تالیف شروع کی اور تکمیل بھی ۱۸ برس میں ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں کہ حدیث لکھنے سے قبل غسل کرکے دو رکعت نماز نفل ادا کرتے تھے، پوری بخاری شریف حرم شریف میں لکھی اور چھ لاکھ احادیث میں سے کل ۷۲۷۵ احادیث منتخب کرکے تحریر فرمایا۔ جب آپ نے بخاری شریف کو مکمل کرکے اس وقت کے جیّد علماء کرام کے سامنے پیش کیا جن میں امام احمد بن حنبل جیسی شخصیت بھی شامل تھیں تو انہوں نے بہت پسند کیا اور اس کی خوبیوں و صحت کی تعریف کی اور صرف چار پر جرح کی۔

وفات امام بخاریؒ جب واپس بخارا تشریف لائے تو شہر کی باہر آپ کے لئے خیمے نصب کئے اور معمولی شخص سے لے کر امرا تک نے آپ کا استقبال کیا۔

بعد میں امیر بخارا سے آپ بدظن ہو گئے کیونکہ اس نے آپ سے اپنی اولاد کیلئے مکان پر بخاری شریف کا درس حاصل کرنا چاہا تھا جس پر آپ نے انکار کردیا۔ اس نے آپ کو بخارا سے نکالا تو آپ سمرقند چلے گئے جہاں آپ کے عزیز اقارب تھے۔ ایک دن آپ نے دعا کی "اے اللہ تیری زمین مجھ پر تنگ ہو گئی ہے اب تو مجھے اپنے پاس بلالے چنانچہ ایک ماہ بعد آپ نے انتقال فرمایا اور علم حدیث کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔

۲- صحیح مسلم مستند کتب احادیث میں بخاری کے بعد صحیح مسلم کا نمبر آتا یہ کتاب امام مسلمؒ نے تالیف کی۔ آپ نیشاپور کے رہنے والے تھے۔ آپ نے حصول علم کے لئے عراق، حجاز، شام اور مصر کا متعدد بار سفر کیا۔ آپ کے اساتذہ میں امام احمد بن حنبل اور اسحٰق بن راھویہ شامل ہیں۔

آپ نے تین لاکھ احادیث میں سے صرف چار ہزار احادیث کو اکھٹا کر کے کتاب کی شکل دی۔ پاک و ھند کے مشہور عالم دین شیخ عبدالحق صحیح مسلم ہی کو سب سے زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔

بخاری اور مسلم دونوں کو ملا کر صحیحین کہا جاتا ہے ان دونوں کتابوں میں اول درجہ کی احادیث جمع کی گئی ہیں۔ بعض احادیث ایسی ہیں جن میں امام مسلم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف چار واسطے ہیں۔ متعدد علماء نے اس کی شرح اور تفسیر لکھی ہیں جن میں امام نوویؒ کی شرح زیادہ مشہور ہے۔

۳۔ سُنن ترمذی سنن ترمذی کے مصنف، امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ ہیں۔ آپ کی قوتِ حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ سفر کے دوران ایک استاد سے ملاقات ہو گئی جن سے امام صاحب نے کچھ احادیث تحریر کی تھیں لیکن انہیں نہ سنا سکے۔ استاد نے کہا تحریر نکالو میں پڑھتا ہوں اس سے مقابلہ کر لو چونکہ آپ سے تحریر گم ہو گئی تھی آپ نے استاد کو سب زبانی سنا دیں، استاد نے مزید امتحان کے لئے چالیس احادیث ایسی سنائیں جو کسی دوسرے استاد کے پاس بھی نہ تھیں آپ نے اسی وقت وہ بھی سنا دیں۔ اس کتاب میں احادیث کی ترتیب فقہ کے لحاظ سے کی گئی ہے جو آسان اور انوکھا طریقہ ہے۔

امام صاحب تقویٰ کے بلند مقام پر تھے اور اللہ تعالیٰ کے خوف سے اس قدر روتے تھے کہ آپ کی بینائی جاتی رہی۔ آپ نے ہر حدیث کے بعد اس کی قسم بھی بیان کر دی نیز راویوں کے نام، لقب اور کنیت تک تحریر کی ہے۔ اس کتاب کی بھی کافی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں عبدالرحمن بن احمد بن حنبل کی شرح قابلِ ذکر ہے جو کہ ۲۰ جلدوں پر مشتمل تھی لیکن زمانے کی دسترس سے ضائع ہو گئی۔

۴۔ سنن ابی داؤد اس کتاب کے مؤلف ابو داؤد ہیں جن کا اصلی نام سلیمان بن اشعث ہے لیکن چونکہ کنیت ابو داؤد ہے اس لئے کتاب کا نام سنن ابی داؤد پڑ گیا۔

آپ نے علم حدیث کے شوق میں مصر، شام، حجاز، عراق اور خراسان کا کونا کونا چھان مارا۔ آپ کے کرتے کی ایک آستین بہت چوڑی اور ایک بہت تنگ تھی جس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ کھلی آستین اس لئے کہ کتاب اور کاغذ اس میں رکھوں جبکہ دوسری کو کھلا رکھنا کپڑے کا اسراف ہے آپ۔ امام احمد بن حنبلؒ آپ کے استادوں میں سے ہیں۔

آپ کے مرتبہ کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ آپ کے استاد نے بھی حدیث آپ سے روایت کی ہے۔

آپ کو پانچ لاکھ احادیث یاد تھیں جن میں سے ۴۸۰۰ احادیث کو منتخب کر کے ایک جگہ کیا اور بعض احادیث ہیں آپ کے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تین راوی ہیں۔ آپ نے جب ان کو کتابی شکل دی تو آپ نے استاد احمد بن حنبلؒ کے سامنے پیش کیا جنہوں نے اسے بہت پسند کیا۔

حسن بن محمد ابراہیم فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خواب میں یہ سنا کہ جو شخص میری سنت پر عمل کرنا چاہتا ہے وہ "سنن ابی داؤد" پڑھے۔

یحیٰ بن زکریا کا قول ہے کہ اسلام کی اصل بنیاد تو قرآن ہے اور اس کا ستون ابو داؤد۔

سنن ابی داؤد کی بھی شرحیں لکھی گئی ہیں جن میں امام خطابی اور قطب الدین عینی کی شرحیں قابل ذکر ہیں جو عربی زبان میں ہیں اور نواب وحید الزماں نے اس کا متن اور ترجمہ شائع کیا۔

۵۔ سُنن نسائی سنن نسائی کے مؤلف احمد بن شعیب نسائی ہیں۔ آپ نے حصول حدیث کے لئے شام، مصر، حجاز، خراسان اور عراق کا سفر کیا اور اسحاق بن راہویہ جیسے استاد سے علم حاصل کیا۔ آپ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار کرتے۔

پہلے جو احادیث مرتب کیں ان کا نام سُنن کبریٰ رکھا بعد میں اس میں سے صحیح احادیث منتخب کر کے ایک کتاب مرتب کی جس کا نام سُنن صغریٰ رکھا یہی کتاب اب سنن نسائی کے نام سے مشہور ہے۔

ابوالحسن کا قول ہے کہ میں تمام اہل علم پر نسائی کو ترجیح دیتا ہوں۔

نسائی کی شرحیں جلال الدین سیوطی اور عبدالہادی سندھی نے عربی زبان میں تحریر کیں۔ نواب وحید الزمان نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔

آپ نے حضرت علیؓ کی تعریف لکھ کر جب دمشق کی مسجد میں سرِ عام پڑھا تو آپ پر شیعہ ہونے کا الزام لگایا گیا اور آپ سے پوچھا کہ امیر معاویہؓ کی تعریف میں بھی کچھ لکھا آپ نے فرمایا کہ اگر اس کی نجات بھی ہو جائے تو بہت غنیمت ہے تعریف کا کیا سوال جس پر وہ لوگ جو امیر معاویہؓ کے طرف دار تھے آپ کو بہت مارا اور آپ بے ہوش ہو گئے۔ جب آپ ہوش میں آئے

تو آپ نے فرمایا کہ مجھے مکہ روانہ کردو تاکہ میری موت وہاں ہو۔ چنانچہ مکہ پہنچ کر آپ نے رحلت فرمائی اور صفا و مروہ کے درمیان آپ کو سپرد خاک کیا گیا۔

سُنن ابن ماجہ اس کتاب کے مؤلف ابو عبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ ابن ماجہ ہے آپ کا تعلق عراق کے شہر قزوین سے تھا۔ آپ کی والدہ کا نام ماجہ تھا اس لئے آپ اسی نام سے مشہور ہوئے۔

حصول حدیث کے لئے آپ نے مدینہ، شام اور مصر کا سفر کیا۔ امام صاحب نے ماجہ کی تالیف کے بعد محدث ابوزرعہ رازی کی خدمت میں پیش کیا آپ نے فرمایا اگر یہ کتاب لوگوں کو میسر آگئی تو وہ حدیث کی دوسری کتاب کی طرف توجہ نہ دیں گے۔

ابن ماجہ کے صحاح ستہ میں شامل ہونے پر اہل علم میں اختلاف ہے کیونکہ بعض علماء جن میں شاہ ولی اللہ بھی شامل ہیں۔ ابن ماجہ کے بجائے موطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شامل کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ابوالفضل بن طاہر مقدسی نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل کیا۔ اس میں کوئی حدیث بھی دوسری مرتبہ بیان نہیں کی گئی اور ایسی احادیث بہت ہیں جن میں ابن ماجہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین راوی ہیں۔ اس کی مقبولیت کے لئے یہ کافی ہے کہ تمام اسلامی ممالک میں یہ درس حدیث میں شامل ہے۔ جلال الدین سیوطی، شیخ کمال الدینؒ، شیخ ابوالحسن سندھیؒ اور شاہ عبدالغنی دہلویؒ نے اس کی شرحیں عربی میں تحریر کیں اور نواب وحید الزماں اور نظیر الحق نے اس کا اردو میں ترجمہ پیش کیا۔

اقسامِ وحی اور تجرید بخاری

یوں تو وحی کی متعدد اقسام ہیں لیکن تجرید بخاری کی روشنی میں مذکورہ اقسام وحی کو بیان کیا جاتا ہے۔

• ــــ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سب سے پہلی وحی جو رسالت مآبؐ پر شروع ہوئی وہ اچھے خواب تھے۔ چنانچہ جو خواب آپ دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہو جاتا

• ــــ وحی کے باب میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپؐ پر وحی کس طرح آتی ہے تو آپؐ نے فرمایا کبھی وحی میرے پاس گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ قسم مجھ پر سب سے زیادہ دشوار ہے۔

• ــــ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنے پر فرمایا کہ کبھی فرشتہ آدمی کی صورت میں میرے سامنے آتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے یہاں تک کہ وہ جو کچھ کہتا ہے میں اسے زبانی یاد کر لیتا ہوں۔

• ــــ وحی کی ایک قسم حضرت جبرئیل کی اپنی اصل صورت میں آنا ہے جیسا کہ غار حرا میں اور پھر سورہ مدثر کی شروع آیات کے وقت جس کا ذکر تجرید بخاری میں موجود ہے۔

• ــــ وحی کے سلسلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تکلیف برداشت کرنی پڑی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، سخت سردیوں کے موسم میں جب آپؐ پر وحی اترتی تو آپؐ کی پیشانی مبارک پسینے سے تر ہو جاتی۔

قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت جو آپؐ پر وحی کی گئی اس کا حضرت عائشہؓ نے اس طرح فرمایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں عبادت فرمایا کرتے تھے اور جب تک آپؐ کو کوئی ضرورت نہ ہوتی گھر نہ لوٹتے اور کئی دنوں تک غارِ حرا میں عبادت میں مشغول رہتے یہاں تک کہ آپؐ کے پاس فرشتہ آیا اور آپؐ سے کہا پڑھ۔ آپؐ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ تین مرتبہ آپؐ اور فرشتہ کے درمیان یہ گفتگو

مرتبہ آپؐ کو پہلے کے مقابلہ میں خوب زور سے دبایا اور قرآن کریم کی یہ آیات تلاوت کیں۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔

اور یہی آیات وحی کی ابتدا ہیں۔

صحابۂ کرام اور خدمات حدیث

سلسلۂ وحی اور احادیث

اس میں شک نہیں کہ صحابہؓ اہل زبان تھے۔ لیکن پھر بھی قرآن کی آیات کا مطلب سمجھنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے۔ سحری کے بارے جب یہ آیت نازل ہوئی "خَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ" تو ایک صحابی اپنے سرہانے کالا اور سفید دھاگا رکھتے اور پھر اسی طرح کا عمل کرتے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تشریح بیان فرمائی تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

صحابہ کرامؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر لگاؤ تھا کہ وہ احادیث پر بھی اسی طرح عمل کرتے جس طرح قرآن پر کرتے اور وحی کی طرح احادیث کو بھی سن کر نہ صرف ذہن میں رکھتے بلکہ لکھ کر محفوظ کر لیتے

حدیث سے صحابہؓ کا شغف

حصولِ احادیث کے لئے صحابہ کرامؓ نے طویل ترین سفر کئے اور طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کیں۔ صحابہ کرامؓ کو روایتِ حدیث سے جو لگاؤ تھا اس کی مثال جابر بن عبداللہ کا حال بیان کرنا کافی ہے

جابر بن عبداللہ

حضرت جابر بن عبداللہ مشہور صحابیؓ تھے۔ آپ نے قصاص کے بارے میں صرف ایک حدیث معلوم کرنے کے لئے پورے ایک ماہ تک سفر کیا۔ اور حدیث معلوم کرتے ہی واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

عہد صحابہ میں تدریس حدیث

عہد صحابہؓ میں تعلیم حدیث کے لئے باقاعدہ مدرس تھے جن میں مکہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی جہاں عبداللہ بن عباس درسِ حدیث دیتے تھے۔ کوفہ میں حضرت ابن مسعودؓ درسِ حدیث تھے اور مدینہ میں بھی باقاعدہ درس حدیث جاری تھا۔ اور ان تمام مدارس کے نگران خلیفہ دوئم حضرت عمر فاروقؓ خود تھے۔ حکومت کی دلچسپی کے باعث حدیث کی دلچسپی دن بدن بڑھ رہی تھی اور طلبہ کی تعداد بھی۔

عہدِ صحابہؓ میں تدوین حدیث کی ضرورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اچھا خاصا حدیث کا سرمایہ تحریر میں آچکا تھا۔ مگر عہدِ صحابہؓ میں احادیث اور سنن کو جمع کرنے کی اس لئے ضرورت پیش آئی کہ مختلف ممالک کی فتوحات اور مختلف اقوام کا اسلام قبول کرنے سے طرح طرح کے مسائل پیدا ہو گئے جن میں مذہبی، اقتصادی و معاشرتی مسائل تھے۔ ان کو مسائل کو حل کرنے کے لئے مسلمانوں کے پاس دو ہی چیزیں تھیں۔ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ۔ جمع قرآن عہدِ صدیقؓ میں شروع ہوا اور عہدِ عثمانی میں ختم ہوا۔ تدوینِ حدیث عہدِ فاروقؓ میں شروع ہوئی اور دورِ خلافتِ عباسؓ میں ختم ہوئی۔

عہدِ صحابہؓ میں حدیث کا تحریری سرمایہ صحابہ کرامؓ کے عہد میں حسب ذیل سرمایہ حدیث موجود تھے

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ نے احادیثِ نبوی کو اکٹھا کیا اور ایک ہزار احادیث ایک صحیفہ میں لکھی ہوئیں جس کا نام الصادقہ رکھا۔

(۲) حضرت ابوبکرؓ نے پانچسو احادیث اکٹھا کی تھیں لیکن احتیاط کی وجہ سے ضائع کر دیا۔

(۳) حضرت علیؓ کے پاس بھی احادیث کا ایک صحیفہ تھا جسے وہ اپنی نیام میں رکھتے تھے۔

(۴) حدیبیہ کا صلح نامہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق حضرت علیؓ نے لکھا جس کی ایک نقل قریش کو دی اور دوسری خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھ لی۔

(۵) فتح مکہ کا اہم ترین خطبہ صحابی ابو شاہ یمنی کی درخواست پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوا کر انہیں عطا فرمایا۔

(۶) سلاطینِ عالم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت اسلام دی تھی جس میں ایک خط شاہِ مصر کے نام تھا جواب تک موجود ہے

(۷) حضرت موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کے فیصلے اور خطوط جمع کر لئے تھے۔

(۸) جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن حزمؓ کو یمن کا حاکم بنایا تو ایک تحریر ان کے حوالے کی جس میں قانونِ میراث اور صداقت اور روایت کے متعلق بہت سی ہدایات درج تھیں۔

(۹) عبداللہ بن حکم کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مردار جانوروں کے متعلق ایک

تحریری ہدایت نامہ روانہ فرمائی تھی۔

(۱۰) وائل بن حجر جو مشہور صحابی تھے جب اپنے گھر جانے لگے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور سے ان کو ایک تحریر لکھوا کر دی جس میں شراب، ربوا، نماز، روزہ اور دیگر بہت سے احکامات درج تھے۔

امام مالک

امام مالکؒ کا تعلق تبع تابعین سے ہے۔ آپ ۹۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔

آپ دراز قد، موٹا جسم، سفید رنگ اور بلند ناک رکھتے تھے۔ آپ کے سر کے بال پیشانی کے قریب کم تھے جو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے مشابہ تھی۔ داڑھی گنجان اور اس قدر لمبی تھی کہ سینہ تک پہنچتی تھی۔ آپ نے ۹۰ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ آپ بہترین قسم کا لباس زیب تن فرماتے تھے کہ جس شخص کو اللہ نے مال و دولت دیا ہو اور وہ اثر ظاہر نہ کرے ایسے شخص کو اللہ دوست نہیں رکھتا کیونکہ اس نے خدا کی دی ہوئی نعمت کو چھپا کر کفران نعمت کیا۔

آپ چاندی کی انگشتری پہنتے تھے جس پر حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ کندہ تھا۔ آپ جس مکان میں رہتے تھے وہ عبداللہ بن مسعودؓ کا تھا۔ آپ مسجد نبوی میں اس جگہ بیٹھتے جہاں حضرت عمرؓ بیٹھا کرتے تھے۔ آپ کھانا تنہائی میں کھاتے تھے۔

امام صاحب باوجود خودداری کے اپنے اہل و عیال اور ملازمین کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آتے اور اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرتے۔

آپ نے تقریباً ۹۵ شیوخ سے کسب فیض کیا۔ آپ غسل فرماتے، عمدہ لباس پہنتے اور پھر خوشبو لگا کر بڑے وقار سے درس دیتے۔ آپ کے درس میں خلیفہ وقت ہارون رشید بھی خود موجود ہوتے۔ شیخ عبدالرحمٰن بن مہدی آپ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر مالک سے بڑھ کر کوئی حدیث نبوی کا امانت دار نہیں ہوا۔ آپ نے ایک لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے کتاب موطا کو مرتب کیا۔ آپ اہل علم کی بڑی مدد فرماتے تھے۔

چنانچہ ابن حبان کا قول ہے کہ مالکؒ تمام فقہاء مدینہ میں علم و فضل اور عبادت کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔

امام شافعیؒ نے بھی آپ کی احادیث سے فیض حاصل کیا جبکہ امام نسائیؒ فرماتے ہیں کہ "میرے نزدیک مالکؒ سے بڑھکر کوئی فصیح تھا اور نہ قابل اعتماد اور ایسا کہ علم حدیث میں اس پر بھروسہ کیا جاتے"۔

آپ کی استقامت علی الحق اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ ایک دفعہ گورنر مدینہ جعفر نے آپ کو حکم دیا کہ آئندہ طلاق کا فتویٰ نہ دیا جائے لیکن آپ نے حق کو چھپانا گوارا نہ کیا اور اس کے حکم کی تعمیل نہ کی۔ اُس نے غضب ناک ہوکر آپ کو ستر کوڑے لگوائے جن سے پیٹ خون آلود ہوگئی اور دونوں بازو اتر گئے۔ خلیفہ منصور جب مدینہ آئے تو آپ سے معذرت کی اور کہا کہ مجھے آپ کی سزا کا علم نہیں، میں جعفر کو اس کی گستاخی کی سزا دوں گا۔ مگر امام مالکؒ نے فرمایا کہ میں تو اسے معاف کر چکا ہوں۔

آپ کی تصانیف میں مشہور مجموعہ حدیث مؤطا۔ ایک رسالہ مالک ابی الرشید۔ احکام القرآن، رسالہ مالک بن مطرب، کتاب المناسک، تفسیر غرائب القرآن، تفسیر القرآن اور کتاب المسائل شامل ہیں۔ امام مالکؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب مؤطا چالیس برس کی سخت محنت کے بعد مرتب کی جو بہت مشہور و مقبول ہوئی

جہاد بخاری کی روشنی میں

جہاد کے لفظی معنی اللہ کی راہ میں اس کا نام بلند کرنے کے لئے کوشش کرنا ہے جہاد مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے " یا ایھا الذین اٰمنوا کتب علیکم القتال۔

۱۔ جہاد بہترین عبادت ہے۔

جہاد افضل ترین عبادت ہے ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے حضورؐ سے پوچھا کہ مجھے ایسی عبادت بتلائیے جو جہاد کے برابر ہو۔ حضور اکرم نے فرمایا مجھے معلوم نہیں۔

۲۔ جہاد کرنے والے کے لئے جنت خدا کے ذمہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم کا یہ ارشاد سنا کہ "جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دن بھر روزہ رکھتا ہے اور رات بھر عبادت کرتا ہے"

نیز اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کے لئے یہ ذمہ داری لی ہے کہ اگر وہ زندہ بچ گیا تو ثواب اور غنیمت اور اگر شہید ہو گیا تو جنت میں داخل ہو گا۔

۳۔ مجاہد جنت کے اعلیٰ مقام میں ہو گا۔

حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ حارثہ کی ماں نے ان کی شہادت کے بعد حضورؐ سے پوچھا کہ میرا بیٹا بدر کے دن مارا گیا آپ مجھے اس کا حال بتائیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اے اُم حارثہ جنت کے اندر بہت سے جنتیں ہیں اور تیرا بیٹا فردوس اعلیٰ میں ہے۔

۴۔ جہاد میں نمائش کی ممانعت

ابو موسیٰ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور سے عرض کیا کہ کوئی آدمی تو مال کے لئے لڑتا ہے کوئی ناموری کے لئے اور کوئی اپنی بہادری دکھانے کے لئے تو پھر مجاہد کون ہے جو خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لئے لڑے وہ مجاہد ہے۔

۵۔ جہاد کو روزے پر برتری۔

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ مشہور صحابی ابو طلحہ حضورؐ کی وفات کے بعد عید الفطر اور عید البقر

کے علاوہ کبھی روزہ ترک نہ کرتے۔ لیکن حضور کے زمانے میں جہاد کی وجہ سے روزہ نہ رکھتے۔

۶۔ جہاد میں امیر کا حکم بغیر گناہ کے ماننا۔

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ جہاد میں ہر حکم ماننا ضروری ہے خواہ وہ ہمیں اچھا لگے یا نہ لگے۔ مگر وہ گناہ کا حکم نہ ہو۔

۷۔ جہاد میں شب خون کی اجازت

حضرت صعب روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ سے میں نے پوچھا کہ مشرکوں پر جب شبخون مارا جاتا ہے تو ان کی عورتیں اور بچے بھی قتل ہو جاتے ہیں۔ تو حضورؐ نے فرمایا کہ وہ بھی انھیں میں سے ہیں۔

۸۔ جہاد میں عورتوں اور بچوں کے قتل کی ممانعت۔

حضرت عبداللہ بن عمر بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے جہاد میں ایک مرتبہ جب مردہ عورت کو پایا تو فرمایا کہ عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کیا جائے۔

۹۔ جہاد میں امن دینے کے بعد قتل ناجائز۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی عہد والے کو قتل کرے گا۔ وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔

غزوۂ تبوک اور واقعۂ حضرت کعب بن مالک

غزوہ تبوک کے واقعہ پر حضرت کعب بن مالک کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا۔ وہ انہی کی روایت کردہ حدیث کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے اور خود حضرت کعب بن مالک کی زبانی۔

اس موقع پر کعب کی حالت

حضرت کعب بن مالک روایت کرتے ہیں کہ میں تمام غزوات میں حضور کے ساتھ شریک رہا سوائے غزوہ تبوک کے۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ اس غزوہ کے موقع پر میں جتنا خوش حال اور قوی تھا اس سے پہلے کبھی نہ تھا۔ اور یہی ایک ایسا موقع تھا جب میرے پاس دو اونٹنیاں تھیں۔

غزوہ میں شریک نہ ہونے کی وجہ

میں کاہلی کی بنا پر اس میں شریک نہ ہو سکا کیونکہ میں یہی خیال کرتا رہا کہ میرے پاس بہت اچھی سواری موجود ہے اس لئے جب چاہوں ان تک پہنچ جاؤں گا لیکن میرے اس شش و پنج میں وہ تبوک پہنچ گئے۔

حضور کا کعب کے متعلق دریافت کرنا

تبوک پہنچ کر جب حضورؐ نے میرے متعلق فرمایا کہ کعب نے یہ کیا کیا جو نہیں آیا۔

حضور کی واپسی

جب مجھے آپ کی واپسی کی خبر ہوئی تو سوچا کہ کوئی بہانہ بنا کر آپؐ کی ناراضگی سے بچ جاؤں لیکن جب حضورؐ مدینہ تک پہنچ چکے تو یہ خیال دل سے اتر گیا۔

منافقین کا طرز عمل

آپ واپسی کے بعد جب دوگانہ پڑھ کر مسجد میں بیٹھے تو تقریباً اسی آدمیوں نے بہانہ بنا کر جھوٹا حلف اٹھایا۔ یہ سب منافق تھے حضورؐ نے ان کے بھیدوں کو خدا کے سپرد کیا۔

حضرت کعب کا جواب

جب مجھ سے حضورؐ نے پوچھا کہ تم غزوہ میں شریک کیوں نہ ہوئے تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جنگ میں حاضر ہونے کے لئے میرے پاس کوئی عذر نہ تھا۔ جس پر حضورؐ نے فرمایا۔ کہ اس نے بالکل سچ کہا ہے۔

حضرت کعب کا بائیکاٹ

حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ جب تک اللہ تمھارے بارے میں کوئی حکم دے۔ اور اس کے بعد میرا مکمل بائیکاٹ کیا گیا۔ میں مسجد میں نماز بھی پڑھتا تھا اور جب میں حضور کو دیکھتا تو وہ منہ پھیر لیتے۔ اور جب میں نماز میں مشغول ہوتا تو میری طرف دیکھتے میرے چچازاد بھائی نے بھی مجھ سے منہ پھیر لیا۔

بادشاہ غسان کا لالچ

ایک دن میں بازار میں تھا کہ ایک نصرانی نے مجھے غسان کے بادشاہ کا خط دیا۔ جس میں لکھا تھا کہ تمھارے دوست محمدؐ نے تم پر ظلم کیا ہے تم ہمارے پاس چلے آؤ بڑی اچھی طرح تمھارا خیال کیا جائے گا۔

حضورؐ کی جانب سے ایک اور سزا

ان حالات میں جب ۴۰ دن گزر گئے تو حضورؐ کی طرف سے حکم ملا کہ اپنی بیوی کو جدا کر دو۔ میں نے پوچھا کیا طلاق دے دوں۔ کہا گیا، نہیں بلکہ علیحدہ کر دو۔ یہی حکم میرے دو ساتھیوں کو دیا گیا۔

کعب کے لئے بشارت

اس حالت میں ہمیں پچاس دن گزر گئے کہ صبح کے وقت یہ اعلان کیا گیا، کہ اے کعب تجھے بشارت ہو میں فوراً سجدے میں گر پڑا اور جس نے یہ آواز دی تھی۔ جب وہ میرے پاس آیا۔ تو میں نے اپنے کپڑے اتار کر اسے دیدیئے حالانکہ اس دن میرے پاس ان کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لہٰذا میں نے وہی اسے دیدیئے۔

سب سے بڑی نعمت

حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ مجھے اب تک اس سے زیادہ کوئی نعمت نہیں ملی کہ میں نے حضورؐ کے سامنے جھوٹ نہیں بولا۔

حضورؐ کی خوشی

جب میں نے حضورؐ کی خدمت میں پیش ہو کر سلام کیا تو حضورؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "تجھے بشارت ہو کہ تیری پیدائش سے لے کر اب تک سارے گناہ معاف ہو گئے۔ تو میں نے عرض کی آپ کی طرف سے یا خدا کی طرف سے تو آپؐ نے فرمایا خدا کی طرف سے۔

توبہ کی قبولیت کا شکرانہ

میں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ میں توبہ کی قبولیت کی خوشی میں اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں خیرات کروں تو حضورؐ نے فرمایا۔ کچھ مال خیرات کر دو اور کچھ اپنے لئے رہنے دو۔ وہ تمھارے لئے

بہتری کا ذریعہ ہوگا۔ جس پر میں نے کہا میں خیبر کا حصہ اپنے پاس رہنے دیتا ہوں اور باقی خیرات کرتا ہوں۔ کیونکہ اللہ نے سچ کی وجہ سے مجھے نجات دی اور میں نے عہد کیا کہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا۔

فتح ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے

میں یقین نہیں کرتا کہ اللہ کسی کو سچ کے باعث مصیبت میں ڈال دے گا اور نہ میں نے اب تک جھوٹ پر اعتماد کیا ہے اور میری معافی کا سبب کبھی جھوٹ نہ بولنا تھا۔

واقعہ حضرت موسیٰ بخاری کی روشنی میں

حضرت ابی ابن کعب حضور اکرم سے روایت کرتے ہیں کہ موسیٰؑ ایک دن بنی اسرائیل میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو لوگوں نے پوچھا کہ لوگوں میں زیادہ جاننے والا کون ہے جس پر موسیٰ نے کہا کہ زیادہ جاننے والا میں ہوں۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے عتاب فرمایا اور کہا کہ تم نے علم کی نسبت خدا کو کیوں نہ دی اور کہا کہ اچھا میرا ایک بندہ مجمع البحرین میں ہے جو تم سے زیادہ جانتا ہے۔

خضر سے طریقہ ملاقات

حضرت موسیٰ نے کہا کہ میں تم سے کس طرح ملوں، حکم ہوا کہ ایک برتن میں مچھلی ڈال کر اس جانب چل پڑو جب مچھلی غائب ہو جائے تو وہیں میرا بندہ ہوگا۔ چنانچہ آپ نے یوشع بن نون کو ساتھ لیا اور چل پڑے۔ جب آپ ایک پتھر پر آرام فرما رہے تھے تو مچھلی برتن سے نکل کر دریا میں کود پڑی۔

موسیٰ کا غلط فہمی میں مبتلا ہونا

آپ مزید ایک دن رات چلتے رہے تو بہت تھک گئے۔ کیونکہ یہ سفر اس سے زیادہ ہو گیا جس کا حکم ملا تھا۔ جب دیکھا کہ مچھی تو اس پتھر کے پاس غائب ہو گئی تو آپ واپس اسی مقام کو لوٹے۔

حضرت خضر سے ملاقات

جب آپ واپس اسی پتھر کے پاس پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ ایک آدمی کپڑا اوڑھے ہوئے کھڑا ہے آپ نے اسے سلام کیا۔ خضر نے جواب دیا کہ دنیا میں تجھ کو سلامتی ہو۔ آپ نے کہا میں موسیٰ ہوں۔ خضر نے کہا کہ بنی اسرائیل کے موسیٰ۔ تو موسیٰ نے فرمایا کہ ہاں اور کہا کیا میں اس امید پر آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں کہ جو کچھ آپ جانتے ہیں مجھے بتا دیں گے۔ حضرت خضر نے کہا تم صبر کر سکو گے، اور خضر نے موسیٰ کو اپنے ساتھ لے لیا۔

پہلا واقعہ

سب سے پہلے خضر نے ایک کشتی والوں کو کہا کہ وہ ان کو کشتی میں سوار ہونے دیں انھوں نے دونوں کو بٹھا لیا اور اپنے سفر کے اختتام پر خضر نے کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ دیا جس پر موسیٰؑ نے تعجب کا اظہار کیا۔

دوسرا واقعہ

کشتی سے اُترنے کے بعد یہ دونوں ایک بستی سے گذرے جہاں بہت سے لڑکے کھیل رہے تھے۔ خضر نے ایک لڑکے کو پکڑ کر اس کا سر کاٹ دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ آپ نے بے گناہ بچے کو قتل کر دیا۔ خضر نے کہا کہ آپ صبر کیوں نہیں کرتے۔

تیسرا واقعہ

آپ دونوں ایک گاؤں سے گزرے اور لوگوں سے کھانا مانگا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ اس شہر میں ایک ایسی دیوار تھی جو گرنے والی تھی۔ خضر نے اسے سیدھا کر دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ اگر آپ چاہتے تو ان لوگوں سے اس کی اُجرت وصول کر لیتے جنہوں نے ہمیں کھانا تک نہ دیا۔ خضر نے کہا اب میرے تمھارے درمیان جدائی ہے اس لئے کہ آپ خاموش نہ رہے۔
حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ اللہ موسیٰؑ پر رحم فرمائے کاش وہ صبر کرتے۔

پرچہ سوم

اشعارِ قصیدہ بردہ کا ترجمہ و تشریح

اور گرامر

۲۹۔ ظلمت سنۃ من احی اظلام الی

ان اشتکت قدماہ الضر من ورم

ترجمہ:۔ میں نے ایسی ذات کی سنت کو ترک کر دیا جس نے عبادت الٰہی کے لئے شب بیداری کی یہاں تک کہ ان کے پاؤں مبارک سوجھ جاتے۔

تشریح:۔ قصیدہ بردہ کا یہ شعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت الٰہی کے ذوق کو پیش کرتا ہے شاعر کا کہنا ہے کہ افسوس ہے ہم نے حضور اکرم کے طریقے پر چلنا چھوڑ دیا۔ حضور نے نہ صرف ہمیں عبادت الٰہی کو اپنانے کا حکم دیا بلکہ اس کا عملی نمونہ بھی پیش کر دیا جس کی مثال شاعر حضرت عائشہ کی ایک حدیث کے مضمون کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ بیان کرتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عبادت الٰہی میں اس قدر مشغول رہتے کہ راتوں کو جب نماز کے لئے قیام فرماتے تو آپ کے قیام کا یہ حال ہوتا کہ کھڑے کھڑے آپ کے پاؤں مبارک کو ورم آجاتا۔ اور جب حضرت عائشہ نے پوچھا اے اللہ کے رسول جب آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے گئے۔ تو پھر عبادت میں اس قدر مشقت آپ کیوں برداشت کرتے ہیں۔ مگر حضور نے فرمایا اے عائشہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ غرضکہ شاعر کا بیان ہے کہ حضور نے ہر عمل کا حکم دینے سے پہلے اس کا عملی نمونہ پیش فرما دیا۔

۳۰۔ وشد من سغب احشاءہ وطوی

تحت الحجارۃ کشحا مترف الادم

ترجمہ:۔ اور جس نے بھوک سے اپنے پیٹ کو مضبوط باندھا اور نرم و نازک جلد پر پتھر باندھ لئے

تشریح:۔ یہ شعر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک کے عملی نمونے کی ایک جھلک ہے۔ اس شعر میں شاعر دراصل غزوہِ خندق کا ایک تاریخی واقعہ اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ غزوہ خندق میں جب ایک مقام پر ایک ایسا پتھر نکلا جو کسی سے ٹوٹ نہ سکا۔ تو حضور سے

اسے اپنے دست مبارک سے ایک ہی ضرب لگا کر چکنا چور کر دیا۔ صحابہ کو حیرت ہوئی۔ انہوں نے اپنے پیٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھائے۔ جن پر ایک ہی پتھر بندھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سب ایک دن سے فاقے میں تھے۔ حضور مسکرائے اور جب اپنے بطن مبارک کی زیارت کرائی تو اس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ یعنی آپ دو دنوں سے فاقے میں تھے۔

سبحان اللہ کیا شان تھی رسالت مآب کی کہ ہر موقع پر آپ کی ذات گرامی کا عملی نمونہ موجود تھا۔

بہرکیف شاعر کا کہنا یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی راہ میں مشقت برداشت کرتے تھے۔ اور مشقت برداشت کرنے میں سب سے آگے تھے جس کی مثال شاعر نے اپنے شعر میں پیش کر دی ہے۔

۳۱۔ وراودۃ الجبال الشم من ذھب

عن نفسہ فاداھا ایما شمہ

ترجمہ:۔ اور سونے کے بلند پہاڑوں نے اس ذاتِ گرامی کو اپنی جانب بلایا لیکن اس نے اپنے آپ کو ان سے بھی بلند ثابت کر دیا۔

تشریح:۔ اس شعر میں بھی حضور اکرم کا اللہ تبارک و تعالیٰ سے لگاؤ اور دنیا سے بے رغبتی بیان کی گئی ہے۔ مشرکین مکہ۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر قسم کی تکالیف آزما چکے اور آپ کو راہِ راست سے نہ ہٹا سکے۔ تو پھر انھوں نے ایک نئی چال چلی۔ آپ کے چچا ابو طالب کے پاس آئے، اور کہا کہ اے ابو طالب اپنے بھتیجے کو کہو۔ کہ اگر تمھیں مال و دولت چاہیئے۔ تو ہم تمھارے سامنے سونے کے ڈھیر لگا دیتے ہیں مگر تم ہمارے بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دو۔ لیکن آپ نے فرمایا اے چچا یہ لوگ اگر میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے پر چاند رکھ دیں گے تو اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے۔ میں خداوند کے حکم کو لوگوں تک پہنچاتا رہوں گا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے کام کرتا رہوں گا۔

نیز ایک مرتبہ جب آپ کی ازواج مطاہرات نے آپ سے مال و دولت کی کمی کی شکایت کی تو اللہ نے اپنے نبی کو فرمایا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ اگر تم کہو تو اس احد کے پہاڑ کو بھی سونا کر دوں۔ لیکن آپ نے اللہ کے حضور عرض کی۔ کہ اے اللہ مجھے تو تیری رضا چاہیئے۔

الغرض شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ حضور نے دین کے مقابلے میں دنیا کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

۳۲۔ واکدت زھدہ فیھا ضرورتہ

ان الضرورۃ لا تعدو علی العصم

ترجمہ۔ اور آپ کی دنیا سے بے اعتنائی نے آپ کو ضروریات زندگی سے اور بھی دور کر دیا۔ کیونکہ حفاظت الٰہی کے سامنے ضروریات زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔

تشریح۔ اس سے پہلے کے اشعار میں شاعر نے حضور کے جذبۂ عبادت الٰہی اور دنیا سے بے تعلقی پر روشنی ڈالی اور اس شعر میں شاعر پھر یہ بیان کر رہا ہے۔ کہ آپ کا یہ دینی لگاؤ ہی تھا۔ کہ قدم قدم پر پیش آنے والی۔ دنیاوی خواہشات آپ کے قدم نہ ڈگمگا سکی بلکہ آپ کی اس دینی محبت نے دنیا سے بے اعتنائی کو اور بھی قوی کر دیا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کی حفاظت کریں۔ اس پر دنیاوی لالچ اور طمع کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہدایات کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔ پھر کس طرح یہ دنیا آپ کو اپنی جانب متوجہ کر سکتی۔

۳۳۔ وکیف تدعوا الی الدنیا ضرورۃ من

لولاہ لم تخرج الدنیا من العدم

ترجمہ:۔ اور کس طرح دنیاوی خواہشات آپ کو اپنی طرف بلائیں جب کہ اگر آپ نہ ہوتے تو دنیا ہی وجود میں نہ آتی۔

تشریح:۔ شاعر نے پہلے اشعار میں آپ کی دنیا سے لاتعلقی اور دینی راہ میں مشقت برداشت کرنے کی جو مثالیں پیش کیں اس شعر میں ان کی وجہ بیان کرتا ہے۔

شاعر کا بیان ہے کہ دنیاوی رغبتیں اس شخص کو منتشر کر سکتی ہیں جو اس دنیا میں آئے اور اس کی رنگینیوں میں اس طرح کھو جائے گویا کہ اس دنیا کے بعد اس کے لئے کچھ اور نہیں اور یہی اس کا مقصد حیات ہے لیکن حضور اکرمؐ کی ذات مبارک وہ ہستی ہے، جن کے طفیل اس دنیا کا وجود عمل میں آیا اور خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر میں نے محمدؐ کو اس دنیا میں نہ بھیجا ہوتا تو دنیا کی پیدائش کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ دنیا آپ ہی کی بدولت جب وجود میں آئی تو اس کی آپ کے سامنے کیا حقیقت ہے۔ پس شاعر کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی خواہش

بھی آپ کو دائرہ حق سے متزلزل نہ کرسکی اور یہی حال مومنین کا ہے کہ ان کے سامنے بھی دنیا ایک حقیر شے ہے اور اسی لئے حضور نے فرمایا کہ دنیا تمھارے لئے بنائی گئی ہے نہ کہ تم دنیا کے لئے

۳۴۔ محمد سید الکونین والثقلین

والفریقین من عرب ومن عجم

ترجمہ:۔ محمدؐ دنیا و آخرت جن و انس اور عرب و عجم کے سردار ہیں۔

تشریح:۔ حضورؐ کی مصروفیات عبادت الٰہی اور دنیا سے بے رخی کا حال بیان کرنے کے بعد شاعر اب آپ کی نبوت اور اس کی حقیقت پر اپنے الفاظ میں اظہار خیال کر رہا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ہمارے نبیؐ صرف عرب یا ایک ہی زمانے کے لئے مبعوث نہیں ہوئے بلکہ آپ تو رحمت للعالمین ہیں۔ دین محمدی پر اللہ تعالیٰ کا ایک احسان عظیم ہے۔ کہ اس دین کے لئے جو پیغمبر آیا وہ رہبری لے کر آیا یعنی حضور اکرمؐ کی حیثیت ہمارے لئے دنیا میں راہ بر و رہنما کی بھی ہے اور آخرت میں شافعی کی بھی۔ اور اس میں کوئی تخصیص بھی نہیں۔ آپؐ کائنات کے سردار ہیں جو کہ دنیا میں سب کی ہدایت کے لئے تشریف لائے۔ اور آخرت میں بھی اپنے پر ایمان لانے والے کی شفاعت فرمائیں گے۔

مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعر خاتم النبیینؐ پر پوری طرح دلالت کرتا ہے۔

۳۵۔ نبینا الامر الناھی فلا احد

ابر فی قول لا منہ ولا نعم

ترجمہ:۔ آپؐ ایسے نبی ہیں جو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔

تشریح:۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر نبی نے اپنی اُمت کو اچھائی کا حکم دیا اور برائی سے منع فرمایا۔ لیکن یہ اعزاز صرف اُمت مرحومہ ہی کو حاصل ہے۔ کہ جس کی سب سے بڑی خوبی کنتم خیر اُمت اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ شاعر کہتا ہے کہ اے حضور اکرمؐ آپ کی ذات گرامی وہ ذات ہے کہ جس نے سب کو نیکیوں کی طرف بلایا اور اپنی اس دعوت کو کسی خاص قوم تک محدود نہیں رکھا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اس دعوت کو جس جرأت کے ساتھ آپ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

یوں تو تبلیغ حضرت عیسیٰ نے بھی کی اور کہا کہ جو تمھارے ایک رخسار پر طمانچہ مارے تم دوسرا بھی اس کے آگے کردو۔ اور نہ حضرت موسیٰ کی طرح کہ ایک اشارے پر قوم فرعون کو دنیا کی ہستی سے مٹا دیا۔ بلکہ احسن طریقے سے دعوت اسلام کو پیش کیا کہ جو افراط و تفریط سے پاک تھی اور ہمیں یہ کہنے میں فخر ہے کہ آپ کی طرح دعوت اسلام کو کوئی پیش نہ کر سکا۔

۳۶۔ ھو الحبیب الذی ترجیٰ شفاعتہ

لکل ھول من الاھوال مقتحم

ترجمہ:۔ وہ ایسے حبیب ہیں کہ جن سے لوگوں کو ہر قسم کے خوف سے شفاعت دلانے کی امید کی جا سکتی ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر حضورؐ کی شفاعت کے بارے میں رطب اللسان ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے حضورؐ آپ ہی کی ذات مبارک ایسی ہستی ہے کہ جن سے ہم شفاعت کی امید کر سکتے ہیں۔

دراصل شاعر اس شعر میں حضورؐ اپنی اس امت کے لئے شفاعت کے سلسلے میں جو چاہت رکھتے ہیں اس کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاعر کا کہنا یہ ہے کہ یہ امت جس وقت بھی بھنور میں پھنسے گی اور اس پر جس قدر اور جب بھی کوئی مصیبت آئے گی تو اللہ کے فضل و کرم سے آپؐ ہی کی ذات مبارک کے طفیل اسے راحت نصیب ہوگی۔ قیامت کے دن بھی جب کہ مسلم پر سخت وقت آن پڑے گا اور تمام انبیائے کرام شفاعت کے لئے معذرت کریں گے تو اس وقت صرف آپ ہی کی ایسی ذات ہوگی کہ جو اس کڑے وقت میں امت مسلمہ کی شفاعت کے لئے اللہ کے حضور سفارش کریگی اور اللہ آپؐ کے طفیل ہم پر رحم و کرم فرمائیں گے۔ الغرض اس شعر میں شاعر شفاعت محمدی کے گن گاتا نظر آرہا ہے۔

۳۷۔ دعا الی اللہ فالمستمسکون بہ

مستمسکون بحبل غیر منفصم

ترجمہ:۔ آپ نے اللہ کی جانب بلایا پس جن نے آپ کی پکار کو مضبوطی سے پکڑا انھوں نے گویا کہ نہ ٹوٹنے والی رسی کو پکڑا۔

تشریح:۔ یہ شعر حضورؐ کی تبلیغ دین اور ہمیں آپؐ کے بتائے ہوئے راستہ پر گامزن ہونے کی تلقین کرتا ہے۔

شاعر کی مراد یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے سخت ترین حالات میں اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ مشرکین نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے آپ کے جسم مبارک پر نجاست پھینکی۔ اور آپ پر پتھروں کی بارش کی یہاں تک کہ آپ کے پاؤں مبارک جوتیوں میں خون کی زیادتی کی وجہ سے پھنس کر رہ گئے تھے۔ لیکن پھر بھی آپ انسانیت سے مایوس نہیں ہوئے اس لئے شاعر بیان کر رہا ہے کہ جس ذات بابرکت نے اتنی تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد ہماری نجات کے لئے ہمیں جو راستہ بتایا اس پر چلنے کے لئے جس راہ عمل کا تعین کیا ہمیں چاہئیے کہ نہ صرف اس پر دل و جان سے عمل کریں بلکہ دوسروں تک بھی اسے پہنچائیں۔ الغرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعر قرآن کی اس آیت کی ایک تفسیر ہے۔ کہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعا

۳۸۔ فاق النبیّین فی خلقٍ وّ فی خلقٍ

ولم یدانوہٗ فی علمٍ ولا کرمٍ

ترجمہ: جس طرح صورت و حسن سیرت میں آپ تمام نبیوں سے بلند ترین اسی طرح وہ علم و کرم میں آپ کے برابر نہیں ہیں۔

تشریح:۔ اس سے پہلے کے اشعار میں تو شاعر نے دین سے آپ کی محبت، آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے میں ہماری نا اہلی دنیا سے آپ کی بے رغبتی اور تبلیغ کے سلسلہ میں آپ کی انفرادیت اور پھر آپ کی تعلیم پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی تلقین کرنے کے بعد اب دوسرے پیغمبروں پر حضورؐ کو جو فوقیت حاصل ہے اس پر اپنی قلم آزمائی کر رہا ہے۔

اس شعر میں شاعر آپ کی افضلیت بیان کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ اے حضورؐ آپ کو تمام انبیاء پر اللہ تعالیٰ نے فضیلت بخشی اور وہ اس طرح کہ آپ صورت میں بھی اس سے بڑھکر اخلاق میں بھی آپ کو معلم الاخلاق کے نام سے اللہ نے پکارا۔ علم میں آپ بغیر تعلیم حاصل کئے بحر بے کراں ہیں۔ اور کرم میں تو آپ پر انتہا ہو چکی تھی یعنی تمام انبیاء ہر لحاظ سے آپ کے درجے تک نہیں پہنچ سکتے اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ نبیوں کے سردار ہیں جس کا ثبوت خداوند کریم نے شب معراج میں بیت المقدس کی نماز کے وقت خود پیش فرما دیا۔

۳۹۔ وکلھم مّن رسول اللہ ملتمس

غرفاً مّن البحر اورشفاً مّن الدّیم

ترجمہ:۔ اور تمام انبیاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بحر اکرم سے ایک چلو بھر یا آپ کی بارش (جود وسخا) سے ایک بار چوسنے کے بقدر پانی کے طلب گار ہیں۔

تشریح:۔ شاعر کہتا ہے کہ حضور اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ نے کرم کا جو بحر بیکراں عنایت فرمایا ہے۔ دیگر انبیاء صرف اس سے ایک چلو بھر پانی کے طلبگار ہیں۔ اور آپ کی سخاوت کی جو بارش ہے اس سے اتنا چاہتے ہیں جیسا کہ ایک چسکی۔ یعنی آپ کا کرم بھی بے حساب اور سخاوت بھی بے پناہ۔ ایک حدیث میں ہے "آپ سے بڑھ کر کوئی بھی سخی نہیں تھا۔ اور خاص کر رمضان المبارک میں آپ کی سخاوت کی یہ حالت ہوتی تھی کہ موسلادھار بارش سے بھی بڑھ کر، مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر چیز میں دوسرے انبیاء پر فضیلت بخشی گئی۔

۴۰۔ وواقفون لدیہ عند حدھم

من نقطۃ العلم او من شکلۃ الحکم

ترجمہ:۔ اور وہ سب انبیاء اپنی حدوں کے مطابق آپؐ کے سامنے اس طرح کھڑے ہیں جیسے علم سے ایک نقطہ اور اعراب کی جتنی حیثیت حکمت میں ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر اشعار گزشتہ کی طرح نبی کریم کی فضیلت دوسرے انبیاءؑ پر بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ پہلے شاعر بیان کر چکا ہے کہ دوسرے انبیاء پر آپؐ کو صورت، سیرت، علم اور کرم میں فضیلت بخشی گئی۔ پس اگر ہم آپ کی فضیلت ان کے علم کے مقابلے میں دیکھیں تو صرف علم کے میدان میں آپ کے مقابلے میں ایک نقطہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اور اگر آپ فضیلت حکمت کو دیکھا جائے تو اس میں ان سب کی حیثیت بقدر اعراب ہے۔

شاعر کا مقصد بیان یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ہر میدان میں دوسرے انبیاءؑ پر فضیلت بخشی۔

۴۱۔ فھو الذی تم معناہٗ وصورتہٗ

اصطفاہُ حبیباً باریُ النسم

ترجمہ:۔ آپ کی ظاہری اور باطنی خوبیاں درجہ کمال رکھتی ہیں۔ پھر آپ کو اللہ تبارک نے اپنا محبوب بنایا

تشریح:۔ اس شعر میں بھی جنابِ رسول پاکؐ کی اس شان کو پیش کیا ہے جس کی بنا پر آپؐ کو محبوب خدا کہا جاتا ہے۔

شاعر کہنا چاہتا ہے کہ آپؐ کمال باطنی اور ظاہری سے پُر ہیں یعنی آپؐ کو تمام ظاہری اور باطنی خوبیاں حاصل ہیں۔ اور اسی بنا پر اللہ نے آپ کو شرف محبوبیت بخشا۔

شاعر کا فرمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو خاص مرتبہ عنایت فرمایا وہ اس وجہ سے کہ کوئی ایسا باطنی کمال نہیں جو آپؐ کی ذات مبارک میں نہ پایا جاتا۔ اور کوئی ایسی ظاہری خصوصیت نہیں جس سے کہ آپؐ متصف نہ ہوں۔ غرض کہ آپؐ گوناگوں خوبیوں کے مالک اور اللہ کے پیارے ہیں۔

۴۲۔ منزہٌ عن شریکٍ فی محاسنہٖ

فجوھرُ الحسنِ فیہ غیرُ منقسمِ

ترجمہ:۔ آپ کے محاسن میں کوئی شریک نہیں اور آپ کا جوہر حسن ناقابل تقسیم ہے۔

تشریح:۔ اس سے قبل شاعر جب رسالت مآبؐ کی خصوصیت بیان کر چکا تو اب وہ ایک دوسرے انداز میں آپ کی فضیلت کو بیان کر رہا ہے یعنی یہ تمام خوبیاں خواہ ان کا تعلق صورت سے ہو۔ سیرت سے ہو یا علم و حکمت سے ان خوبیوں میں آپؐ یکتا ہیں۔ اور کوئی بھی آپؐ کی طرح تمام تو کجا کسی ایک صفت میں بھی مکمل نہیں اس لئے کہ جناب نبی کریمؐ کو جو خوبیاں عطا فرمائی گئیں وہ ناقابل تقسیم ہیں۔ اور کوئی دیوی یا دیوتا ان میں شریک نہیں۔ یہ آپ کا خاصہ نبوت ہے اور نبوت ایک اللہ کا انعام ہے۔

۴۳۔ دع ما ادعتہُ النصاریٰ فی نبیھم

واحکم بما شئتَ مدحاً فیہ واحتکمِ

ترجمہ:۔ تم عیسائیوں کی باتوں کو چھوڑ کر جو انھوں نے اپنے نبی کے بارے میں کہیں جو چاہو آپؐ کی تعریف میں کہو۔

تشریح:۔ نبی کریمؐ کی صفات مبارک اور ان کی دوسرے انبیاؑ پر فضیلت بیان کرنے کے بعد شاعر ساتھ ہی ساتھ اس بات کی تلقین بھی کر رہا ہے کہ ہمارے نبی اگرچہ بلند ترین مقام پر فائز ہیں لیکن انھیں اُلوہیت خداوندی کا درجہ دینا کسی طرح جائز نہیں۔

شاعر عیسائیوں کی مثال دیتے ہوئے یہ بیان کرتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر حضرت عیسٰی کی صفات اس قدر بڑھائیں کہ حدود سے تجاوز کر گئے یہاں تک کہ انھیں خدا اور خدائی میں شریک اور ابن اللہ تک کا درجہ دے دیا۔ اور اس چیز نے انھیں گمراہی کے گڑھے میں گرا دیا۔
الغرض شاعر کا مدعا یہ ہے کہ تم حضرت محمدؐ کی جتنی تعریف کرو لیکن حد کے اندر رہ کر۔

۴۴۔ وانسب الٰی ذاتہٖ ماشئتَ من شرفٍ
وانسبْ الٰی قدرہٖ ماشئتَ من عظمٍ

ترجمہ:۔ اور آپؐ کی ذات کو جو شرف چاہو دو اور آپؐ کے مرتبہ میں جو بڑھائی چاہو بیان کرو۔
تشریح:۔ اس شعر میں شعر گزشتہ کی طرح نبی کریم کے پرستاروں کو شاعر کا یہ پیغام ہے کہ آپ کی ذات مبارک اس قدر متبرک اور مقدس ہے کہ جس شرف کو بھی اس ذات مقدس سے منسوب کیا جائے تو کم ہے اور جہاں تک آپؐ کے اعلیٰ مرتبہ کا ذکر ہے وہ اتنی اعلیٰ اور ارفع ہے کہ جتنی بڑی سے بڑی بڑائی اور بزرگی کو اس کی جانب نسبت دی جائے کم ہے۔
یعنی آپؐ کی ذات مبارک اور مرتبہ سوائے الوہیت کے ہر تعریف کے مستحق ہے۔

۴۵۔ فانّ فضلَ رسولِ اللہ لیس لہٗ
حدٌّ فیعرب عنہ ناطقٌ بفمٖ

ترجمہ:۔ بے شک رسول اللہ صلعم کے فضائل کی کوئی حد نہیں جس کو بولنے والا بیان کر سکے۔
تشریح:۔ شاعر کہتا ہے کہ جہاں تک رسول کے فضائل کا تعلق ہے وہ اس قدر کثرت سے ہیں کہ اگر انھیں بیان کرنا چاہیں تو ناممکن ہے۔ یعنی حضور صلعم کی ذاتِ مبارک مجموعہ فضائل ہے آپؐ کی عملی زندگی آپ کا پیغام۔ آپ کی عبادت، آپ کے دوسروں سے تعلقات، آپ کا رہن سہن، آپ کی نجی زندگی۔ آپ کی گھریلو زندگی، آپ کی معاشرتی زندگی اور آپ کا میدان جنگ میں ہونا غرض یہ کہ ہر مقام اور ہر موقع پر آپؐ کی زندگی کے جوہر جو سامنے آتے ہیں۔ اگر انھیں بیان کرنے کی کوشش کریں تو ہماری عاجز زبان کے بس کی بات نہیں یعنی آپؐ کے فضائل ناقابل بیان ہیں۔

۴۶۔ لو ناسبت قدرہٗ آیاتہٗ عظما

احیی اسمہٗ حین یدعی دارس الرمم

ترجمہ۔ اگر آپ کی نشانیاں بلندی میں آپ کی طرح ہوتیں تو آپ کا نام لینے سے مردہ ہڈیاں زندہ ہو جاتیں۔

تشریح۔ اس شعر میں بھی شاعر آپ کی بلندیٔ عظمت کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اس بیان میں ایک طرف تو وہ آپ کو عطا کردہ معجزات اور دوسری جانب آپؐ کی عظمت کو پیش کر رہا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ آپؐ کی ذات مبارک وہ شخصیت ہے کہ اگر آپ کی حیثیت کے مطابق آپ کو معجزات بھی دیئے جاتے تو آپ کا نام ہی لینے سے مردے اٹھ کھڑے ہوتے۔

اس شعر میں دراصل یہود اور انصار کی اس منہ شگافی پر ایک تازیانہ ہے جس میں وہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے پیغمبر کی نشانی (حضرت عیسیٰ) کہ وہ مردوں کو زندہ کردیا کرتے تھے۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ اے بدبختو مردوں کو زندہ کرنا کمال نہیں کمال تو یہ ہے کہ مردہ دلوں کو زندہ کیا جائے۔ جسم کو اٹھا کر کھڑا کرنے سے کیا فائدہ اور ہمارے پیغمبر حضرت محمد کو جو عظیم معجزہ یعنی قرآن پاک عطا کیا گیا صرف وہ ایک ہی تا قیامت انسانیت کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

۴۷۔ لم یمتحنا بما تعی العقول بہ

حرصاً علینا فلم نرتب ولم نہم

ترجمہ۔ آپؐ نے ہماری ہدایت کی بنا پر ہمیں ایسی آزمائشوں میں مبتلا نہ کیا جس سے ہماری عقل عاجز آجاتی اس لیے ہم نہ تو حیران ہوئے اور نہ شک میں پڑے۔

تشریح۔ دراصل یہ شعر، شعر گزشتہ سے پیوستہ ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ ہمارے پیغمبر کی تعلیمات ایسی نہیں کہ جو ہمیں دنیائے طلسم میں پہنچادیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سیدھی سادھی تعلیمات کی بنا پر آپ کے امتی ان باتوں سے بچے رہیں جن میں پہلی امتیں مبتلا ہو کر تباہ ہوگئیں۔ جیسا کہ عیسائیوں نے جب اپنے پیغمبر کے ہاتھوں مردوں کو زندہ ہوتے دیکھا تو اپنے پیغمبر کو خدائی میں شریک یا درپھر خدا سمجھ بیٹھے۔ اسی طرح موسیٰ کے حیرت زدہ معجزات

کو دیکھکر فرعون جیسے بادشاہ نے انھیں ایک جادوگر سے بڑھ کر حیثیت نہ دی۔ لیکن ہمارے پیغمبر کو ایسے معجزات نہیں دیئے گئے جو عقل کو حیران کرتے۔ بلکہ ایسے معجزات دیئے گئے جو عقل کو راہ راست پر لے آئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس اُمت نے اپنے پیغمبر کو خدا کا نبی ہی سمجھا اور وہ بھی اپنی طرح ایک انسان۔

۴۸۔ اَعْیَی الوَرٰی فَہمُ مَعنَاہُ فَلَیسَ یُرٰی

لِلقُربِ وَالبُعدِ فِیہِ غَیرُ مُنفَحِمِ

ترجمہ:۔ دنیا کو آپ کے کمالات نے عاجز کر دیا۔ اور اس کی حیثیت کو سمجھنے کے لئے قریب اور دوری کا کوئی سوال نہ رہا۔

تشریح:۔ یہ شعر بھی گزشتہ اشعار سے اپنے معنوں کی بنا پر منسلک ہے شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ یہ بات صحیح ہے کہ آپ کو جو معجزات عطا فرمائے گئے۔ وہ عقل کو حیرت میں ڈالنے والے تو نہ تھے لیکن اس کے باوجود دنیا کو عاجز کر دینے کے لئے کافی تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی اصل تک پہنچنے کے لئے جتنے آج کے لوگ عاجز ہیں اسی طرح خود آپؐ کے زمانے کے لوگ بھی عاجز تھے۔

ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ آپ کے قریب تھے اور جو آپ کے ساتھ گفت شنید میں شریک رہتے وہ بھی آپ کے کمالات کو سمجھنے میں قاصر تھے۔ جس طرح کہ ہم ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کو لیجئے۔ جس کے چیلنج کا مقابلہ نہ تو آپؐ کے دور کا بڑے سے بڑا شاعر کر سکتا تھا اور نہ آج کوئی کر سکتا ہے۔

غرض یہ کہ آپؐ کے کمالات حیرت زدہ نہ سہی لیکن عاجز زدہ ضرور ہیں۔

۴۹۔ کَالشَّمسِ تَظہَرُ لِلعَینَینِ مِن بُعُدٍ

صَغِیرَۃً وَّ تُکِلُّ الطَّرْفَ مِن اَمَمِ

ترجمہ:۔ آپؐ گویا سورج کی مانند ہیں جو دور سے تو چھوٹا لیکن قریب سے آنکھوں کو تھکا دینے والا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر نے حضور اکرمؐ کے کمالات کی مثال سورج سے دی ہے کہ سورج جو دور سے ہمیں ایک چھوٹا سا ٹکڑا دکھائی دیتا ہے لیکن اگر اسے غور سے دیکھا جائے تو چہ

شانیوں میں آنکھوں کو چیندھیا دیتا ہے۔

یعنی آپ کے کمالات سورج کی ان کرنوں کی طرح ہیں کہ جو زمین سے اتنی دوری کے باوجود اسے فیض یاب کرتی ہیں۔ اسی طرح کمالات محمدیہ ہیں کہ انھوں نے نہ صرف اپنے زمانے میں لوگوں کو راہ راست پہ لگایا بلکہ اس کے بعد آج بھی آپؐ کے ان کمالات سے لوگ فیضیاب ہو رہے ہیں اور آپ کی پیروی میں دین اور دنیا کی فلاح حاصل کر رہے ہیں۔

۵۰- وکیف یدرک فی الدنیا حقیقتہ

قوم نیام تسلوا عنہ بالحلم

ترجمہ:- اور دنیا آپ کی حقیقت سے کس طرح آگاہ ہو کیونکہ آپ کی مثال اس قوم کی ہے جو خواب سے بیدار ہو کر اس پر قناعت کرے۔

تشریح:- اس سے پہلے شعر میں شاعر نے حضور اکرم کے اعلیٰ ترین کمالات کو سورج کی آب و تاب سے تشبیہ دی تھی۔ اور اب اس شعر میں یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ آپؐ کی حقیقت کو جاننا اس دنیا کا بس نہیں اس لئے کہ اس قوم کی مثال اس شخص کی ہے کہ جو ایک سہانہ خواب دیکھے اور پھر بیدار ہو جانے کے بعد اس پر اکتفا کر لے۔

یعنی آپؐ ان صفات اعلیٰ کے مالک ہیں جن کو سمجھنے کے لئے ان ہی صفات سے متصف ہونے کی ضرورت ہے۔ حاصل یہ کہ ہم تو آپؐ پر ان دیکھے ایمان لے آئے جس طرح کہ آدمی خواب دیکھتے ہیں۔ حقیقت حال سے بے خبر ہو کر۔

۵۱- فمبلغ العلم فیہ انہ بشر

وانہ خیر خلق اللہ کلھم

ترجمہ:- علم کی پہنچ تو یہاں تک ہے کہ آپؐ بشر ہیں اور اللہ کی تمام مخلوق سے بہتر ہیں۔

تشریح:- اس شعر میں شاعر آپ کی ذاتی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے یہ بیان کر رہا ہے کہ جہاں تک آپ کی ذات گرامی کا تعلق ہے اور اسے ہم علم کے ذریعے جس حد تک پہچان سکتے ہیں وہ یہ کہ آپ دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں مگر اللہ نے جو بھی مخلوق پیدا کی اس میں آپ کا درجہ سب سے بڑھ کر ہے۔

دراصل اس شعر کو ہم قرآن کریم کی اس آیت سے تطبیق دے سکتے ہیں ـــــ کہ انما انا بشر مثلکم یوحی الی یعنی میں تو تمھاری طرح ایک انسان ہوں مگر اس لحاظ سے افضل ہے کہ میری جانب اللہ کی وحی آتی ہے۔

۵۲۔ وکل ای اتی الرسل الکرام بہا

فانما اتصلت من نورکا بہم

ترجمہ اور وہ تمام نشانیاں جو دوسرے برگزیدہ پیغمبر لائے پس وہ آپؐ ہی کے نور کی وجہ سے لائے۔

تشریح:۔ اس سے پہلے کے چند اشعار میں بھی شاعر نے "فضلنا بعضہم علی بعض" کے تحت جناب رسالت مآب کی فضیلت دوسرے انبیاء پر بیان کی تھی اور اب اس شعر میں بھی یہ بیان کر رہا ہے۔ کہ دوسرے تمام انبیاء کو جو الگ الگ معجزات دیئے گئے وہ بھی آپؐ ہی کی ذات گرامی کی بنا پر۔ عیسٰیؑ کا معجزہ مُردوں کو زندہ کرنا اور بیمار کو اچھا کرنا۔ موسٰیؑ کا معجزہ ید بیضا اور لاٹھی کو سانپ بنانا۔ لیکن آپؐ نے نہ صرف اپنے زمانے کے مردہ دل لوگوں کو زندہ کر دکھایا بلکہ قیامت تک آپؐ کا پیغام مردہ دلوں کو زندہ کئے جا رہا ہے۔

۵۳۔ فانہ الشمس فضل ہم کواکبہا

یظہرن انوارہا للناس فی الظلم

ترجمہ:۔ بے شک آپؐ سورج کی مانند ہیں اور دوسرے انبیاء ستاروں کی مانند جو کہ لوگوں کو اندھیرے میں روشنی دکھاتے ہیں۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر حضور اکرم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپؐ کی مثال چاند کی ہے اور دوسرے انبیاء کی مثال ستاروں کی ہے جیسا کہ ظاہری رات کی تاریکی میں تو روشنی ستاروں کی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت ستارے یہ روشنی چاند سے حاصل کرتے ہیں۔ دراصل یہ شعر قرآن کی اس آیت کی تشریح پر مبنی ہے "الیوم اکملت لکم دینکم" یعنی آپ کی حیثیت تو کامل دین کی ہے اور دوسرے انبیاء نے جو تعلیمات پیش کیں ان سب کی انتہا آپؐ کی ذات گرامی سے ہوئی۔

الغرض دوسرے انبیاء ابتدائے دین تھے اور آپؐ انتہائے دین۔

۵۴۔ حتیٰ اذا طلعت فی الکونِ عمّ ھُدا

ھا العالمین واحیت سائراً لاھم

یہاں تک کہ جب یہ طلوع ہوا تو اس کی ہدایت سب کے لئے ہو گئی۔ اس نے سب کو زندہ کر دیا۔

یہ شعر دراصل گزشتہ شعر کی مزید تشریح ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آپؐ سے پہلے ہر زمانے اور ہر قوم میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ہدایت کے لئے انبیاء کو مبعوث فرمایا اور انھوں نے اپنی اپنی قوموں کو ان کے مزاج کے مطابق معجزات دکھا کر انھیں راہ حق پر لانے کی کوشش کی ان میں سے بعضوں کو تو ناحق قتل کیا گیا اور بعضوں کو جھٹلایا گیا۔ اور بہت کم لوگ ایمان لائے۔

چونکہ آپ رحمت اللعالمین تھے اس لئے جب آپؐ کو منصب رسالت سے نوازا گیا تو کسی خاص قوم اور زمانے کی قید نہ رہی لیکن آپؐ کی تعلیمات ساری دنیا کے لئے تھیں۔ اسی لئے آپؐ نے عرب و عجم دونوں کے مردہ دلوں کو زندہ کر دیا اور وہ اس لئے کہ آپ تمام جہانوں کے آخری پیغمبر بن کر آئے تھے۔

۵۵۔ اکرم بخلق نبی زانہٗ خلقٌ

بالحسنِ مشتمِل بالبشرِ متسِمٖ

ترجمہ۔ آپ کی صورت کتنی اچھی ہے۔ جسے سیرت نے زینت بخشی اور حسن اور خندہ پیشانی پر مشتمل ہے

تشریح۔ اس شعر میں شاعر پھر ایک دفعہ آپؐ کی حسن سیرت اور صورت پر روشنی ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ حضور اکرمؐ کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح ظاہری صورت بخشی اسی طرح سیرت میں بھی آپؐ اپنی مثال آپ تھے۔ اس لئے کہ آپ کا بیانِ مبارک خندہ پیشانی پر مشتمل تھا۔ اور آپ کو دیکھنے والا پہلی ہی مرتبہ آپ پر جان نثار کر دینے میں فخر محسوس کرتا۔

دراصل شاعر نے اس شعر میں حسن و صورت و سیرت کو یکجا کر کے آپؐ کی صفاتِ عالیہ کے بیان میں خوب زور پیدا کیا۔ اور ظاہر ہے کہ عمدہ صورت اس کے ساتھ بہترین سیرت اور پھر خندہ پیشانی و کشادہ دلی یہ سب چیزیں یکجا ہو کر انسانیت کو کمالِ انتہا تک پہنچا دیتی ہیں۔ جو کہ ہر لحاظ سے ایک بہترین آئیڈیل بن جاتی ہے۔

۵۶۔ کالزھر فی ترف والبدر فی شرف
والبحر فی کرم والدھر فی ھمم

ترجمہ۔ گویا کہ آپؐ تروتازگی میں شگوفہ کی طرح، بلندی میں کامل۔ کرم میں بحر اور بلند بختی میں زمانے کی طرح ہیں۔

تشریح۔ یہ شعر بھی دراصل رسالت مآبؐ کی صفات بیان کرتا ہے اس میں شاعر نے آپؐ کی تروتازگی کو شگوفہ سے مثال دی ہے اور بلندی میں آپ کو چودھویں کے چاند سے تشبیہہ دی ہے مہربانی اور کرم میں بحر ناپیدا کنار سے اور بلند بختی میں زمانے سے، شاعر کا کہنا یہ ہے کہ اگر آپؐ کو ظاہری دیکھا جائے تو آپ کی ذاتِ مبارک شگوفہ نورس کی طرح ہر وقت تروتازہ معلوم ہوتی ہے۔ اور بزرگی میں بالکل اسی طرح جیسے چودھویں کا چاند ضرب المثل ہے۔ اور اگر سخاوت میں دیکھا جائے تو جس طرح سمندر کی کوئی حد نہیں اسی طرح سخاوت اور کرم بھی ناپیدا کنار ہیں اور اگر بلند بختی کو دیکھیں تو جس طرح زمانہ دوسروں پر تو اثر انداز ہوتا ہے لیکن خود ایک چٹان کی طرح اسی جگہ قائم ودائم ہے اسی طرح آپؐ ہیں جس کی مثال تاریخ سے مختلف معجزات کے موقع پر موجود ہے۔

۵۷۔ کانہٗ وھو فردٌ فی جلالتہٖ
فی عسکر حین تلقاہٗ وفی حشم

ترجمہ۔ اگرچہ آپؐ تنہا ہیں لیکن رعب و دبدبے میں ایک فوج کی مانند۔

تشریح۔ اشعار گزشتہ کی طرح شاعر اس شعر میں بھی آپ کی صفات کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کہ آپؐ اگرچہ ایک فرد واحد ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے جو جلال و رعب بخشا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک پوری فوج کے ساتھ ہیں۔ دراصل یہ بات ہمیں مختلف غزوں سے بھی ملتی ہے کہ کئی موقعوں پر ایسا ہوا کہ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن جناب رسالت مآب تن تنہا میدان میں ڈٹے رہے، غزوائے حنین اور احد جس کی مثالیں ہیں۔ یہ شانِ جلالی نہیں تو اور کیا ہے کہ غزوہِ حنین کے موقع پر چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی مسلمان میدان سے ہٹ چکے تھے لیکن آپؐ تنہا وہاں موجود تھے، اور مسلمانوں کو پکار کر کہہ رہے تھے کہ اے مسلمانو! میں اللہ کا سچا نبی ہوں۔ آپؐ کی للکار پر مسلمان دوبارہ قدم جما کر

کافروں پر فتح حاصل کرتے ہیں۔

۵۸۔ کانما اللؤلؤ المکنون فی صدفٍ

من معدنی منطقٍ منہ ومبتسم

ترجمہ۔ گویا کہ جیسے موتی سیپ میں اور لب بولنے کی دو کانیں ہیں جو کہ مسکرا رہی ہیں۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر آپؐ کے دندان مبارک اور ہونٹوں کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ یعنی آپؐ مسکراتے ہیں تو ایسے جس طرح سیپ میں سے موتی چمکتے ہیں اور آپ گفتگو فرماتے ہیں تو گویا پھول جھڑتے ہیں۔ یعنی شاعر آپؐ کے انداز گفتگو اور طریقہ تبسم کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب آپؐ گفتگو فرماتے ہیں یا مسکراتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے آپؐ کا دھن اور لب مبارک دو کانوں کی طرح ہیں۔ در ہائے دنداں یوں پوشیدہ ہیں جیسے سیپ میں موتی۔ دور سے سیپ دیکھنے میں ایک عام چیز معلوم ہوتی ہے لیکن جب اس کو کھولا جائے تو آبدار موتی اس میں سے حاصل ہوتے ہیں جن کی چمک دمک انسانوں کو ششدر کر دیتی ہے۔

۵۹۔ طیب یعدل تربًا ضمّ اعظمہ

طوبیٰ لمنتشقٍ منہ وملتثم

ترجمہ:۔ کوئی خوشبو آپؐ کے جسد مبارک کی خاک سے بہتر نہیں۔ مبارک ہیں اس کو چومنے والے اور سونگھنے والے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر حضور اکرمؐ کی عقیدت میں کچھ اس طرح محو ہے کہ حضور اکرمؐ کے جسم مبارک پر جو دھول بھی لگی ہے۔ اس کی حیثیت کا کیا پوچھنا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر خوشبو سے بڑھ کر ہے۔ اور قابل مبارک باد ہیں وہ لوگ جنھیں اس کو سونگھنے اور چومنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

شاعر دراصل اس شعر میں ان ہستیوں پر رشک کر رہا ہے جنھیں حضور اکرم کا ساتھ حاصل تھا اور جنھوں نے ہر ہر قدم پر آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہو کر اپنے لئے فلاح اور کامرانی کی راہ متعین کی۔

الغرض ان تمام اشعار میں شاعر نے مختلف انداز سے حضور اکرمؐ کی مدح فرما کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

۹۰۔ دعنی ووصفی ایاتٍ لہ ظہرت

ظہور نار القریٰ لیلاً علیٰ علم

ترجمہ: مجھے آنحضرت صلعم کے معجزوں کو بیان کرنے دو۔ جو ایسے ہی نمایاں اور مشہور ہیں جیسی کہ ضیافت کی آگ جو رات کو پہاڑ پر جلائی جائے۔

تشریح: اس شعر میں ایک دفعہ پھر شاعر معجزات محمدؐ سے بحث کر رہا ہے۔ شاعر کا بیان یہ ہے کہ آپؐ کے معجزات کا کیا کہنا جس نے زمانہ قحط کی فراوانی میں بدل دیا اور اس کی وجہ سے لوگوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان میں سے آپؐ نے انھیں نکال لیا۔ یہ شعر دراصل ایک حدیث کی شرح سے مطابقت رکھتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ صحابی نے یہودی کا قرض دینا تھا۔ اور صحابی کے باغ میں کھجوریں اتنی نہ تھیں۔ کہ اس کا قرض چکایا جاسکے۔ معاملہ رسالت مآبؐ تک پہنچا۔ آپؐ نے یہودی کو مہلت دینے کو کہا لیکن وہ نہ مانا۔ آپؐ نے تین دفعہ بات کی۔ پر آخرکار تھوڑی دیر وہیں پر انتظار فرمایا اور صحابی کو حکم دیا کہ اس ایک درخت کو کاٹنا شروع کرو۔ جب ایسا کیا گیا تو صرف ایک درخت سے اس کا قرض چک گیا۔ اور پھر بھی اس میں کمی نہ آئی ظاہر ہے کہ اس باغ کے ایک درخت سے مقصد پورا ہو جاتا جو پہلے پورے کا پورا باغ بھی اس کو پورا نہ کر سکا سب سے بڑا معجزہ ہے۔

۹۱۔ فالدر یزداد حسناً وّ ھو منتظمٌ

ولیس ینقص قدراً غیر منتظم

ترجمہ: پس اگر موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے لیکن اگر انھیں ایک لڑی میں نہ بھی پرو دیا جائے تو ان کے حسن قدر میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تشریح: اس شعر میں شاعر کا مدعا یہ ہے کہ اگر میں حضور اکرمؐ کی مدح کروں تو ان کو چار چاند لگا دیتا ہے اور اگر ان کی تعریف کوئی نہ کر سکے تو رسالت مآب کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ خاتم انبیاء ہیں اور رہیں گے۔

ان کی تعریف کرنا ہمارے اپنے لئے ذریعہ نجات ہے ہم ایسا کرکے ان پر احسان نہیں کرتے بلکہ کچھ حق ادا کر رہے ہیں

۹۲۔ فما تطاول آمال المدح نحوه

مَا فِيه من كرم الاخلاق والشيم

ترجمہ:۔ پس آپ کی تعریف کرنے والے آپ کی ذاتی خوبیوں اور اخلاقیات تک نہ پہنچ سکے۔

تشریح:۔ اس شعر میں بھی شاعر حضور اکرمؐ کی بے پناہ خوبیوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ شاعر کا بیان ہے کہ جناب محمد اتنی خصوصیات کے حامل ہیں کہ جن کا مکمل بیان مدحوں کے بس میں نہیں۔

آپؐ کی تخلیق ہی مندرجہ اخلاق کے بلند مرتبہ پر کی گئی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے "انک لعلی خلق عظیم"۔ شاعر کہتا ہے کہ اسی بناء پر آپ کی تعریف کرنیوالوں نے آپؐ کے معجزات پر ہی اکتفا کیا۔

زندگی کا وہ کونسا شعبہ ہے جس پر آپ اونچے مقام پر نہ ہوں۔ آپؐ نے بحیثیت منصف ہر میدان میں انصاف کو مقدم رکھا۔ اس لئے مداح مجبور ہے کہ وہ آپ کی زندگی کے کسی ایک حصہ کو اپنے لئے تسکین کا سامان بنائے۔

۹۳۔ ایات حق من الرحمٰن محدثۃٌ

قدیمۃٌ صفۃُ الموصوفِ بالقدم

ترجمہ:۔ اللہ کی سچی نشانیاں باعتبار نزول فانی اور باعتبار معنی ایسی لافانی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر نے اب آپ کی ذاتِ مبارک سے ہٹ کر ان معجزات میں سے ایک عظیم معجزے یعنی قرآنِ پاک کے محاسن کی طرف رخ کیا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ آیاتِ کلام پاک بھی باقی کائنات کی طرح فانی ہیں۔ جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ کہ قیامت کے قریب اللہ تعالیٰ اس دنیا سے قرآنِ پاک کو اٹھا لے گا۔ لیکن جہاں تک ان کے معنی اور ہدایات کا تعلق ہے وہ اسی طرح لافانی ہیں۔ جیسا کہ خود اللہ تبارک۔ مثلاً قرآن نے کہہ دیا کہ اللہ احد، اگرچہ یہ آیت قرب قیامت تو اٹھ جائے گی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ ایک ہے اور ایک رہے گا۔

۹۴۔ لم تقترن بزمانٍ وّھی تخبرنا
عن المعادِ وعن عادٍ وّعن اِرم

ترجمہ:۔ یہ کسی زمانے کے متعلق نہیں بلکہ ہمیں آخرت عاد اور ان کے باغات کی خبر دیتی ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں بھی آیاتِ کلام پاک سے بحث کی گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ قرآنِ کریم سے جو مضامین پیش کئے ان کا تعلق کسی خاص زمانے سے نہیں وہ صرف موجودہ دور ہی کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔ بلکہ ماضی و مستقبل کے ان حالات کو بھی بطور احسن پیش کرتا ہے۔ مثلاً قوم عاد کا رہن سہن اس طرح بیان کیا کہ اس طرح تاریخ بھی بیان کرنے سے قاصر ہے۔ پس قرآن کا یہ بہت بڑا معجزہ ہے۔

۹۵۔ دامت لدینا ففاقت کلّ معجزۃٍ
مِنَ النبیّین اذجاءت ولم تدم

ترجمہ:۔ انھیں دوام نصیب ہوا اور وہ تمام معجزات پر فوقیت لے گئے۔ جو کہ کسی بھی نبی کو حاصل نہ ہو سکا۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر قرآن کریم کی دوسری آسمانی کتابوں پر فوقیت بیان کر رہا ہے۔ شاعر کا بیان ہے کہ اس سے قبل انبیا پر بھی اللہ تعالیٰ نے طرح طرح کے معجزے نازل فرمائے کسی کو قدرت دی گئی کہ لوہے جیسے سخت دھات کو موم کی طرح قابو میں رکھیں کسی کو مردہ زندہ کردینے کا معجزہ حاصل تھا اور کسی کو ایک لاٹھی کے ذریعے فرعون جیسے جابر بادشاہ پر فوقیت بخشی۔

مانا کہ یہ سب معجزے اللہ کی بہت بڑی نشانیاں تھیں اور اس وقت کے تقاضوں کے بھی مطابق مگر ان میں سے کوئی بھی ایسا معجزہ نہ تھا جو رہتی دنیا تک قائم رہتا۔ ان انبیائ کے ساتھ ان کے معجزے بھی رخصت ہو گئے۔ لیکن آنحضرت صلعم کو جو سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم دیا وہ تاقیامت اسی طرح باقی رہے گا۔ جس طرح جناب رسالت مآب کے زمانے میں تھا اس لئے کہ خدا نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔

۹۶۔ محکمات فما یبقین من شبہٍ
لذی شقاقٍ وّلا یبغین من حکم

ترجمہ:۔ یہ بالکل واضح اور شک شبہ سے بالاتر ہیں یہ احکامات بیان کرتی ہے اور کسی حاکم کی محتاج نہیں۔

تشریح:۔ قرآن کریم کی آیات کی معجزانہ حیثیت کو بیان کرنے کے بعد شاعر اب ان میں بیان کردہ احکامات کی حیثیت کو واضح کر رہا ہے شاعر کہہ رہا ہے کہ قرآن کریم کی ان آیات میں جو احکام بیان کئے گئے ہیں وہ بالکل واضح ہیں اور ان میں کسی قسم کی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ جیساکہ خود قرآن پاک کا بیان ہے۔ ذالک الکتاب لا ریب فیہ اور آیات احکام میں جو فیصلے بیان کئے گئے ہیں وہ بھی اس قدر صحیح اور قابل قبول ہیں کہ ان کی تشریح کے لیے کسی فیصلہ کرنے والے کی ضرورت نہیں۔ یعنی قرآن میں ہماری روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا جو حل پیش کیا گیا ہے جیساکہ ہم اپنے ہمسائے سے کس طرح پیش آئیں۔ ماں باپ کے کیا حقوق ہیں اور والدین کے ذمہ اولاد کے کیا فرائض ہیں۔ شوہر کو بیوی پر کیوں فوقیت حاصل ہے اور معاشرے کی اصلاح کے لئے ان دونوں کو کس طرح مل جل کر کام کرنا ہے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر احکامات جو بیان کئے گئے ہیں بغیر کسی حاکم کے بھی ایک اچھے معاشرے کی بنیاد ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔

۹۷۔ ماحوربت قط الاعادمن حرب

أعدى الاعادی الیہا ملقی السلم

ترجمہ:۔ ان سے کبھی بھی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور جس نے سرکشی کی خواہ وہ کتنا ہی سرکش کیوں نہ ہو آخر عاجز آ گیا۔

تشریح:۔ اس شعر میں بھی شاعر آیات کلام پاک کی معجزانہ حیثیت پر بحث کر رہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اول تو کسی کو یہ ہمت ہی نہیں ہوتی کہ وہ قرآن پاک کا مقابلہ کر سکے۔ یعنی جب خود خدا نے اس کا کھلا چیلنج دیا کہ "وان کنتم فی ریب مما تنزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہٖ" اگر کسی نے یہ غلطی بھی کی کہ چلو قرآن جیسی کچھ آیات بنا ڈالیں تو خود اس کی قوم نے اس کا مذاق اڑایا۔ جیساکہ عرب کے ایک مشہور شاعر نے قرآن کی چند آیات وضع کی تھیں لیکن وہ اخلاقیات سے اتنی گری ہوئی تھیں کہ خود اس کی قوم نے اس پر لعن طعن شروع کر دیا۔ اور جب ایک صحابی نے خانہ کعبہ پر سورۂ کوثر لکھ کر لٹکائی تو شاعر عرب بول اٹھے کہ یہ کوئی آسان کلام نہیں۔

الغرض قرآن کو کسی بھی طرح جھٹلانا نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اہل عرب جو کہ اس زبان کے ماہر تھے جب اس مقابلے کی تاب نہ لاسکے تو تا قیامت اور کسی کا بس کہاں۔

۹۸- ردّت بلاغتہا دعوی معارضہا

ردّ الغیور ید الجانی عن الحرم

ترجمہ:۔ آپ کی بلاغت نے مخالفین کے دعوں کو اس طرح دور کیا جیسے غیرت مند آدمی گناہ کار کے ہاتھ سے اپنے حرم کو دور رکھتا ہے۔

تشریح:۔ اس شعر میں شاعر نے آیاتِ کلام پاک کو ان کی معجزانہ کیفیت سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاعر کا بیان ہے کہ کلام پاک کی آیات بلاغت کے اس مقام پر فائز ہیں کہ مخالفین اسلام نے اگر اس کی مثال پیش کرنے کی کوشش کی تو بھی اس اعلیٰ ظرافت کا مقابلہ نہ کرسکے تشاعر تمثیلاً بیان کرتا ہے کہ جس طرح ایک غیرت مند انسان یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی اس کی عزت کی طرف بری نگاہ سے بھی دیکھے تو خداوند کریم کس طرح آیاتِ کلام پاک کی بلاغت میں کمی دیکھ کر مخالفین کو ذرّہ بھر بھی موقع فراہم کرتا۔ پس آیاتِ کلام پاک کی بلاغت پہچاننا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

۹۹- لہا معانٍ کموج البحر فی مددٍ

وفوق جوہرہٖ فی الحسن والقیم

ترجمہ:۔ ان کے معنی اونچائی میں سمندر کی لہر کی مانند ہیں۔ اور حسن و قیمت میں سمندری موتیوں سے بڑھ کر۔

تشریح:۔ آیاتِ کلام پاک کی لفظی خصوصیات بیان کرنے کے بعد اب شاعر آیات کے مفہوم کی برتری کی جانب آتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ جس طرح سمندر کی موجیں لا محدود ہیں اور جن کا تعلق کسی خاص موقع محل سے نہیں ہوتا۔ اسی طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم بھی اپنے اندر وسعت کو لئے ہوتے ہیں۔ ان کی جس قدر تشریح کی جائے گی تشنگی پھر بھی باقی رہے گی۔ اور جہاں تک ان کی حسن و قیمت کا تعلق ہے یعنی ان کی طرف راغب ہونے کا تعلق ہے تو سمندر کے قیمتی موتی بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ یعنی یہ آیات اپنے مفہوم اور ظاہری خوبصورتی میں بھی لاجواب ہیں۔

۱۰۰۔ فما تعد ولا تحصی عجائبہا

ولا تسام علی الاکثار بالسام

ترجمہ:۔ پس نہ تو ان کی خصوصیات گنائی جاسکتی ہیں اور نہ ہی ان کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کثرت کے باوجود ملال غم و فکر سے مبرا ہیں۔

تشریح:۔ قرآن میں جو طرح طرح کے مضامین بیان کئے گئے ہیں کہیں ماضی کی یادیں ہیں تو کہیں مستقبل کا حال، کہیں نافرمانوں کا حشر ہے اور کہیں فرمانبرداروں کے انعامات کا تذکرہ۔ یہ اور اس طرح کے دیگر گوناگوں واقعات اس قدر ہیں کہ نہ تو ان کا شمار ممکن ہے اور نہ انھیں محیط کیا جاسکتا ہے اگرچہ قرآن کریم ایک ضخیم کتاب ہے اور اس کی اکثر آیات مکرر بھی ہیں لیکن پھر بھی تلاوت کلام پاک کرنے والا خواہ وہ کتنی ہی مرتبہ کسی سورہ کو کیوں نہ پڑھ ڈالے وہ اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ قرآن کریم کے عجائبات اس قدر رغبت دلاتے ہیں کہ بہت زیادہ ہونے کے باوجود پڑھنے والے کی یہ خواہش رہتی ہے کہ وہ پڑھتا ہی رہے، بالخصوص بعض سورتیں تو ایسی ہیں کہ ان کو تلاوت کرنے سے دل و دماغ کو وہ سکون ملتا ہے جو کہیں اور سے نہیں حاصل ہوسکتا۔

۱۰۱۔ قرت بہا عین قاریہا فقلت لہ

لقد ظفرت بحبل اللہ فاعتصم

ترجمہ:۔ قرآن کو پڑھنے والوں کو آنکھوں کی ٹھنڈک ملتی ہے پس میں نے اسے پڑھنے والے کو کہا کہ تو کامیاب ہوا۔ اللہ کی رسی کو پکڑا پس اسے مضبوطی سے تھام رکھ۔

تشریح:۔ شاعر قرآن کی لفظی و معنوی خصوصیات بیان کرنے کے بعد اب اس کے اثرات پیش کر رہا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ تلاوت کلام پاک سے آنکھوں کو جو ٹھنڈک اور دل کو جو سکون حاصل ہوتا ہے وہی اس کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میں تو پڑھنے والے کو یہی کہوں گا کہ تو کامیاب ہوگیا۔ اس لئے کہ تو نے اپنے اللہ کی رسی کو پکڑ لیا۔ اور اسے تھامے رکھو اسی میں تیری کامیابی ہے۔ یعنی تلاوت کلام سے نہ صرف جسمانی راحت حاصل ہوتی ہے بلکہ روحانی تسکین بھی۔

ظاہر ہے کہ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اگر اس پر اس طرح عمل کیا جائے جیسا کہ اس کا حق ہے تو فلاح دارین حاصل ہونا یقینی ہے ۔۔ سورہ بقرۃ کے شروع میں جب قرآن پر عمل

کرنے والوں کی خصوصیات بیان کردی گئیں تو ساتھ ہی یہ خوش خبری بھی دے دی گئی کہ

■ "واولائک ھم المفلحون"

۱۰۲۔ ان تتلھا خیفۃ من حر نار لظی
اطفات حر لظی من وردھا الشبم

ترجمہ اگر تم اس کی تلاوت جہنم کی گرم آگ کے ڈر سے کرو تو تم اس کی ٹھنڈک سے اس آگ کو بجھا دو گے۔

تشریح:۔ گزشتہ شعر میں شاعر نے یہ کہا تھا کہ تلاوت کلام پاک باعث نجات ہے۔ اب وہ مزید تشریح کرتے ہوئے بیان کر رہا ہے کہ اگر اللہ کے خوف سے تم اس کی تلاوت کرو اور مقصد تمہارا اس عذاب سے چھٹکارا پانا ہو جس کا گمان بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ تو اس کی تلاوت میں وہ تاثیر ہے کہ تمھیں اس عذاب سے دور رکھا جائے گا۔ دراصل شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ تم کسی بھی مقصد کے لئے تلاوت کلام پاک کرو گے تمھیں کامیابی ہوگی۔ وہ مثال کے طور پر کہتا ہے کہ جہنم کی آگ کو بھی یہ ٹھنڈا کر سکتی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ ایسا ہوا نمرود نے جب حضرت ابراہیمؑ کو دھکتی آگ میں ڈالا تو جونہی ابراہیمؑ نے آپ کو پکارا تو خدا کا ارشاد ہوا:۔ یانار کونی برداً وسلاماً علی ابراھیم۔ یعنی آگ ٹھنڈی ہوئی تو کس طرح خدا نے ابراہیم کو کہا کہ یہ دعا پڑھ، تو پھر کیوں نہ ہم بھی تلاوت کلام سے معجزے ابراہیمی کی یاد تازہ کریں اور نہ صرف نمرود کی آگ بلکہ دوزخی آگ کو ٹھنڈا کریں۔

۱۰۳۔ کانھا الحوض تبیض الوجوہ بہ
من العصاۃ وقد جاءوہ کالحمم

ترجمہ:۔ گویا کہ یہ حوض کوثر ہے جس سے گنہگاروں کے کوئلے جیسے چہرے سفید ہو جاتے ہیں۔

تشریح:۔ اس شعر میں بھی کلام پاک کی عظمت کا بیان ہے۔ شاعر ایک حدیث کے مفہوم کو لیتے ہوئے قرآن کی ایک اہم خصوصیت کو بیان کر رہا ہے جس کا تعلق صحابہ کی زندگی سے ہے۔ حدیث کا مفہوم اس طرح ہے۔ کہ وہ مسلمان جو اپنے گناہوں کی سزا پوری کرنے کے بعد دوزخ

سے رہائی پا جائیں گے تو دوزخ کی آگ سے جل کر ان کے جسم کوئلہ کی طرح ہو جائیں گے۔ اللہ کے حکم سے فرشتہ انھیں جنت میں لے جانے سے پہلے حوض کوثر کے پانی سے نہلائیں گے۔ جس سے ان کے جسم نورانی ہو جائیں گے۔ یعنی دیگر اہل جنت کی طرح وہ بھی بہترین صورت میں ہو جائیں گے" شاعر کہتا ہے کہ بالکل یہی اثر تلاوت کلام پاک کا ہے کہ خواہ معصیت کی وجہ سے ہمارے دل کتنے ہی کالے کیوں نہ ہو جائیں قرآن کی تلاوت ان کو جمال بخشتے ہوئے تر و تازہ کر دیگی۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ کہ قیامت کے دن قرآن سب سے بڑی شفاعت ہوگی۔ جس نے اس کی تلاوت کی ہوگی اس کی بخشش کے لئے یہ اللہ سے سفارش کریگا۔

۱۰۴- وکالصراط وکالمیزانِ معدلۃً

فالقسطُ من غیرہا فی الناس لم یقم

ترجمہ:۔ اور یہ عدل و انصاف میں صراط اور میزان کی طرح ہے۔ پس ان کے بغیر لوگوں کے درمیان انصاف کرنا ناممکن ہے۔

تشریح:۔ قرآن پاک کی آیات انسانی معاشرے کے لئے کتنی اہم ہیں اس شعر میں شاعر اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ جس طرح قیامت کے دن اچھے اور برے لوگوں کا فیصلہ پل صراط اور میزان کے ذریعہ کر دیا جائے گا اور جس نے جو کچھ بھی کیا ہے اسے اپنے سامنے پائے گا۔ جیسا کہ خود قرآن کا ارشاد ہے۔ "فمن یعمل مثقال ذرۃٍ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃٍ شراً یرہ" یعنی جو ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا اور جو ذرہ بھر برائی کرے گا اس کا صلہ مل کر رہے گا۔ جس طرح یہ دونوں چیزیں روز جزا پرکھنے کا معیار ہیں اسی طرح لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے قرآن سے بہتر کوئی معیار نہیں۔

انسانی معاشرے کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی دونوں میں قرآن ہر ہر قدم پر رہنمائی کرنے کے لئے کافی ہے۔ پس نیکی اور بھلائی اچھے اور برے کا اگر امتیاز کرنا ہو تو وہ صرف قرآن ہی کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے جو قرآنی معیار پر اترے وہی اچھا ہے۔

۱۰۵۔ لا تعجبن لحسود راح ينكرها

تجاهلاً وهو عين الحاذق الفهم

ترجمہ:۔ تعجب نہیں کرنا چاہیئے اگر کوئی حسد اور جان بوجھ کر جاہلیت کی بنا پر اس سے انکار کرے، خواہ وہ بہت ماہر اور سمجھ دار ہی کیوں نہ ہو۔

تشریح:۔ آیات کلام پاک کی بلاغت کی لفظی خوبصورتی اور اس کے جسمانی اور روحانی اثرات بیان کرنے کے بعد اب شاعر ایک حقیقت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر ان تمام گوناگوں خصوصیات کے باوجود کوئی قرآن کی عظمت سے انکار کرے تو کوئی تعجب کی بات نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا یہ انکار سچائی پر مبنی نہیں۔ بلکہ حسد اور جان بوجھ کر مخالفت برائے مخالفت کا سبب ہے۔

اس شعر میں شاعر نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ جانتے تھے کہ قرآن برحق ہے لیکن ان کی حسد اور جاہ و جلال ان کو حقیقت کے انکار پر مجبور کر رہی تھی۔ ایسے لوگوں پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ ان کی اپنی بدبختی ہے۔ دراصل اس شعر میں حضور اکرمؐ کو ایک طرح کی تسلی دی گئی ہے کہ اگر کوئی قرآن پاک کو اللہ کی کتاب تسلیم نہیں کرتا تو یہ اس کی کج روی ہے۔ جس کا خمیازہ اسے آخرت میں عذاب الہٰی کی صورت میں بھگتنا پڑے گا۔

۱۰۶۔ قد تنكر العين ضوء الشمس من رمد

وينكر الفم طعم الماء من سقم

ترجمہ:۔ کبھی آنکھ بیماری کے سبب سورج کی روشنی کا انکار کر دیتی ہے۔ اور منہ بیماری کے سبب پانی کو کڑوا سمجھتا ہے۔

تشریح:۔ یہ شعر دراصل شعر گزشتہ سے پیوستہ ہے جس میں شاعر نے یہ کہا تھا کہ عظمت قرآنی سے انکار ذاتی کج روی ہے۔ اور اب یہ کہہ رہا ہے کہ جس طرح آشوب چشم کے مریض سے اگر سورج کی روشنی کا پوچھا جائے تو وہ یہی کہے گا کہ کیسی روشنی اور ایسا مریض جو بیماری کے سبب منہ کا ذائقہ کھو چکا ہو اسے پانی پلا کر پانی کا ذائقہ پوچھیں تو گویا اس کے زخموں پر نمک چھڑکنا ہے۔

اس شعر میں شاعر نے قرآن کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے بہت عمدہ مثال

پیش کی ہے۔ ہماری روزمرہ زندگی کا مشاہدہ یہ ہے کہ واقعی اس طرح کے مریض جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں تو اس چیز کی اصلیت تو نہیں بدلتی بالکل اسی طرح کوئی اپنی کم علمی، حسد اور جاہلانہ روش پر چلتے ہوئے قرآنی حقیقت سے انکار کرے تو اس کا یہ انکار قرآن کی عظمت کو زائل تو نہیں کرتا۔ بلکہ خود اس کی بے وقوفی کی نشان دہی ہوتی ہے۔

فعل

تعریف :۔ کلمہ ہے جو کسی دوسرے کلمہ کی مدد کے بغیر تنہا اپنے معنی بتلائے اور تینوں زمانوں میں سے کوئی زمانہ اس سے ظاہر ہو۔ اور اس میں کسی کام کے کرنے یا ہونے کا ذکر کیا جائے۔ جیسے نَصَرَ (اس نے مدد کی) یَنْصُرُ (وہ مدد کرتا ہے یا کریگا)۔
اُنْصُرْ (تو مدد کر) لَاتَنْصُرْ (تو مدد نہ کر) وغیرہ

اقسام :۔ فعل کی چار قسمیں ہیں۔

(۱) ماضی (۲) مضارع (۳) امر (۴) نہی

فعل ماضی۔

تعریف :۔ ماضی وہ فعل جس سے کسی کام کا گزرے ہوئے زمانہ میں ہونا یا ہو چکنا معلوم ہوتا ہے۔

اقسام :۔ فعل ماضی کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں۔

فعل ماضی معروف۔ فعل ماضی مجہول۔ ماضی مطلق۔ ماضی قریب۔ ماضی بعید، ماضی استمراری۔ ماضی شکیہ۔ ماضی تمنائی یا شرطیہ۔

ماضی معروف (مطلق)

تعریف :۔ وہ فعل ہے جو کسی کام کے گزشتہ زمانہ واقع ہونے کا پتہ دے۔ اس میں زمانہ کی نزدیکی یا دوری کا ذکر نہ ہو اور اس کا فاعل بھی معلوم ہو۔

گردان فعل ماضی معروف

جنس		واحد	تثنیہ	جمع
غائب	مذکر	فَتَحَ	فَتَحَا	فَتَحُوْا
	مؤنث	فَتَحَتْ	فَتَحَتَا	فَتَحْنَ
مخاطب	مذکر	فَتَحْتَ	فَتَحْتُمَا	فَتَحْتُمْ
	مؤنث	فَتَحْتِ	فَتَحْتُمَا	فَتَحْتُنَّ
متکلم	مذکر مؤنث	فَتَحْتُ	فَتَحْنَا	

قاعدہ :۔ (۱) ماضی معروف (سہ حرفی) کے صیغہ واحد مذکر غائب کے پہلے اور تیسرے

حرف پر ہمیشہ زیر ہوتی ہے لیکن درمیان کے حرف پر تینوں حرکات میں سے کوئی ایک حرکت آتی ہے۔ جیسے کَتَبَ ۔ شَرِبَ ۔ حَسُنَ

۲۔ صیغہ واحد مونث غائب کے بعد اگر فاعل یا مفعول یا کوئی اور لفظ معرف باللام آئے تو اس وقت آخری حرف (ت) کی جزم کی جگہ زیر پڑھنی چاہیئے۔ جیسے فَتَحَتِ الْبَابَ (اس عورت نے دروازہ کھولا)

۳۔ جن صیغوں کے آخر میں الف یا واؤ ہو اگر ان کے بعد کا لفظ معرب باللام ہو تو اس صیغہ کو معرب باللام سے ملاتے وقت اس الف یا واؤ کا تلفظ نہیں کیا جائے گا۔ جیسے۔ شَرِبَا الْمَاءَ ۔ فَتَحُوا الْبَابَ ۔

۴۔ ماضی معروف کو ماضی مطلق بھی کہتے ہیں۔

ماضی قریب

ماضی مطلق کے پہلے قَدْ لگانے سے ماضی قریب بن جاتا ہے۔

ماضی بعید

ماضی مطلق سے پہلے کان لگانے سے ماضی بعید بن جاتا ہے۔

کان کی پوری گردان درج ذیل ہے۔

	جنس	واحد	تثنیہ	جمع
غائب	مذکر	کَانَ	کَانَا	کَانُوْا
	مونث	کَانَتْ	کَانَتَا	کُنَّ
مخاطب	مذکر	کُنْتَ	کُنْتُمَا	کُنْتُمْ
	مونث	کُنْتِ	کُنْتُمَا	کُنْتُنَّ
متکلم	مذکر مونث	کُنْتُ	کُنَّا	

ماضی استمراری:۔ تعریف وہ فعل ہے جس سے ظاہر ہو کہ کوئی کام زمانہ گزشتہ میں کافی دیر تک بار بار ہوتا رہا ہے۔

بنانے کا طریقہ:۔ فعل مضارع پر لفظ کان لگانے سے ماضی استمراری بن جاتا ہے

مضارع کے صیغوں کے ساتھ کَانَ کے صیغے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

ماضی شکیہ:۔ وہ فعل ماضی ہے جس میں فعل کا ہونا گزرے ہوئے زمانے میں شک و شبہ کے ساتھ پایا جائے بمثلاً لَعَلَّ زَيْدًا ذَهَبَ (شاید زید گیا ہوگا)

بنانے کا طریقہ:۔ (۱) ماضی مطلق کے پہلے لعل لگانے سے ماضی شکیہ بن جاتی ہے۔

(۲) ماضی مطلق پر یکون داخل کرنے سے بھی ماضی شکیہ کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جیسے يَكُوْنُ زَيْدٌ ذَهَبَ

نوٹ:۔ لعل فعل سے متصل نہیں آسکتا اس کے بعد کسی اسم کا آنا ضروری ہے اس کے بعد جو اسم آئے گا وہ منصوب ہوگا۔ لعل کے بعد ضمیر بھی آسکتی ہے۔ ماضی شکیہ کی گردان ماضی مطلق کی طرح ہوگی۔

ماضی تمنائی یا ماضی شرطیہ:۔ اس ماضی میں فعل گزرے ہوئے زمانہ میں شرط یا آرزو کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

بنانے کا طریقہ:۔ (۱) ماضی پر لَوْ بڑھانے سے ماضی شرطیہ کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے جیسے لَوْ زَرَعْتَ لَحَصَدْتَ (اگر تو بوتا تو ضرور کاٹتا)

(۲) لَيْتَ یا لَيْتَمَا (کاش) بڑھانے سے بھی ماضی تمنائی کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔

ماضی مجہول:۔ وہ فعل ہے جس میں گزشتہ زمانہ میں کوئی فعل وقوع پذیر ہوا لیکن کام کرنے والے کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔

اس کا وزن ثلاثی مجرد میں ہمیشہ فُعِلَ کے وزن پر ہوتا ہے۔

نوٹ:۔ فعل مجہول کے ساتھ فاعل نہیں آتا بلکہ صرف مفعول ہوتا ہے۔ اس کو نائب فاعل کہتے ہیں اور فاعل کی طرح رفع دیتے ہیں۔

گردان

جنس		واحد	تثنیہ	جمع
غائب	مذکر	فُتِحَ	فُتِحَا	فُتِحُوْا
	مونث	فُتِحَتْ	فُتِحَتَا	فُتِحْنَ
مخاطب	مذکر	فُتِحْتَ	فُتِحْتُمَا	فُتِحْتُمْ
	مونث	فُتِحْتِ	فُتِحْتُمَا	فُتِحْتُنَّ
متکلم	مذکر مونث	فُتِحْتُ	فُتِحْنَا	

مضارع

تعریف :- وہ فعل ہے جس میں حال اور مستقبل دونوں زمانے پائے جاتے ہیں۔ جیسے یَذْھَبُ (وہ جاتا ہے یا جائے گا)

بنانے کا طریقہ :- ماضی کے پہلے صیغہ (واحد مذکر غائب) کے پہلے لفظ کو ساکن کرکے اس کے شروع میں الف۔ ت۔ ی۔ ن میں سے کوئی حرف لگا دیں اور آخری حرف کو پیش دے دیں۔ جیسے ضَرَبَ سے اَضْرِبُ، عَلِمَ سے نَعْلَمُ، نَصَرَ سے یَنْصُرُ

اَقسام :- مضارع کی دو قسمیں ہیں۔

معروف اور مجہول۔

مضارع معروف :- فعل مضارع معروف وہ ہے جس کا فاعل مذکور ہو۔ جیسے (خالد بیٹھتا ہے یا بیٹھے گا)

گردان

جنس		واحد	تثنیہ	جمع
غائب	مذکر	یَذْھَبُ	یَذْھَبَانِ	یَذْھَبُوْنَ
	مؤنث	تَذْھَبُ	تَذْھَبَانِ	یَذْھِبْنَ
مخاطب	مذکر	تَذْھَبُ	تَذْھَبَانِ	تَذْھَبُوْنَ
	مؤنث	تَذْھَبِیْنَ	تَذْھَبَانِ	تَذْھِبْنَ
متکلم	مذکر مونث	اَذْھَبُ	نَذْھَبُ	

مضارع مجہول :- وہ فعل ہے جس میں کوئی کام زمانۂ حال یا مستقبل میں واقع ہوا ہو۔ لیکن اس کے فاعل کا کچھ پتہ نہ ہو جیسے یُقْتَلُ (وہ قتل کیا جاتا ہے یا کیا جائے گا)

نوٹ :- مضارع مجہول کا صرف ایک وزن یُفْعَلُ آتا ہے۔

بنانے کا طریقہ :- علامت مضارع الف۔ ت۔ ی۔ ن کو پیش دے کر عین کلمہ یا آخری سے پہلے حرف کو زبر دیا جاتا ہے۔ جیسے یَنْصُرُ سے یُنْصَرُ

گردان

جنس		واحد	تثنیہ	جمع
غائب	مذکر	یُذْهَبُ	یُذْهَبَانِ	یُذْهَبُوْنَ
	مونث	تُذْهَبُ	تُذْهَبَانِ	یُذْهَبْنَ
مخاطب	مذکر	تُذْهَبُ	تُذْهَبَانِ	تُذْهَبُوْنَ
	مونث	تُذْهَبِیْنَ	تُذْهَبَانِ	تُذْهَبْنَ
متکلم	مذکر مونث	اُذْهَبُ	نُذْهَبُ	

فعل امر حاضر

وہ فعل ہے جس میں مخاطب کو کوئی کام انجام دینے کا حکم دیا جائے یا اس سے کوئی درخواست و فرمائش کی جائے۔

بنانے کا طریقہ:۔ امر حاضر مضارع سے بنتا ہے اس کے بنانے کا طریقہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ علامت مضارع کو حذف کردیں اور آخری حرف کو ساکن کردیں یعنی اس پر جزم دے دیں۔

۲۔ علامت مضارع کو حذف کرنے کے بعد دیکھیں کہ پہلا حرف (کلمہ ف) ساکن ہے یا متحرک، اگر متحرک ہو تو ایسے ہی رہنے دیں وہی فعلِ امر کا صیغہ ہوگا جیسے وَعَدَ کا مضارع یَعِدُ ہے۔ علامت مضارع کو حذف کرنے اور آخری کلمہ کو جزم دینے سے عِدْ بنتا ہے۔ یہی فعل امر حاضر ہے اسی طرح یَجِدُ سے جِدْ، یَصِلُ سے صِلْ، یَرِثُ سے رِثْ بنتے ہیں۔

اگر بیچ میں کوئی حرف علت ہو تو وہ گر جائے گا جیسے یَطِیْرُ سے علامت مضارع حذف کرنے اور آخر کو ساکن کرنے سے طِیْرْ بنتا ہے ی جو حرف علت ہے گر جائے گا اور طِرْ رہ جائے گا اس طرح یَصِیْرُ سے صِرْ، یَکُوْنُ سے کُنْ۔ یَقُوْلُ سے قُلْ بنتا ہے

۳۔ اگر علامت مضارع کے بعد کا حرف کلمہ ف ساکن ہو تو علامت مضارع حذف کرنے کے بعد اس کی جگہ ہمزۂ وصل لگا دیں اور آخری حرف یعنی ل کلمہ کو ساکن کردیں تو پھر دیکھیں

اگر عین کلمہ مضموم ہو تو ہمزۂ وصل کو پیش دیں جیسے یَنْصُرُ سے اُنْصُرْ۔ تکتُبُ سے اُکْتُبْ۔ اگر عین کلمہ مفتوح یا مکسور ہو تو ہمزۂ وصل کو زیر دیں۔ جیسے یَفْتَحُ سے اِفْتَحْ۔ یَضْرِبُ سے اِضْرِبْ۔

لام کلمہ اگر حرف علت ہو تو گر جائے گا جیسے یَدْعُوْ سے اُدْعُ۔ یَرْثِیْ سے اِرْثِ۔ یَرْضیٰ سے اِرْضِ۔ وغیرہ۔

گردان فعل امر حاضر معروف

جنس	واحد	تثنیہ	جمع
مذکر	اُقْتُلْ	اُقْتُلَا	اُقْتُلُوْا
مونث	اُقْتُلِیْ	اُقْتُلَا	اُقْتُلْنَ

نوٹ:۔ امر حاضر کے شروع میں جو ہمزۂ وصل بڑھایا جاتا ہے جب اس کے ماقبل کوئی لفظ متحرک ہو تو وہ ہمزۂ وصل بولا نہیں جاتا۔ جیسے یَا دَمُ اسْکُنْ۔

امر مجہول (غائب۔ حاضر۔ متکلم۔)

بنانے کا طریقہ:۔ مضارع معروف سے پہلے لام مکسور لگا دو۔ علامت مضارع پر ضمہ دو اور عین کلمہ پر فتح اور لام کلمہ کو جزم دو۔ جیسے یَضْرِبُ سے لِیُضْرَبْ

گردان

جنس		واحد	تثنیہ	جمع
غائب	مذکر	لِیُضْرَبْ	لِیُضْرَبَا	لِیُضْرَبُوْا
	مونث	لِتُضْرَبْ	لِتُضْرَبَا	لِیُضْرَبْنَ
مخاطب	مذکر	لِتُضْرَبْ	لِتُضْرَبَا	لِتُضْرَبُوْا
	مونث	لِتُضْرَبِیْ	لِتُضْرَبَا	لِتُضْرَبْنَ
متکلم	مذکر مونث	لِاُضْرَبْ	لِنُضْرَبْ	

فعل امر معروف، غائب و متکلم

بنانے کا طریقہ:۔ مضارع معروف کے صیغہ واحد مذکر غائب سے پہلے لام مکسور لگا دو۔ اور آخر میں جزم دے دو۔ جیسے یَضْرِبُ سے لِیَضْرِبْ

گردان

جنس		واحد	تثنیہ	جمع
غائب	مذکر	لِیَضْرِبْ	لِیَضْرِبَا	لِیَضْرِبُوْا
	مونث	لِتَضْرِبْ	لِتَضْرِبَا	لِیَضْرِبْنَ
متکلم	مذکر مونث	لِاَضْرِبْ	لِنَضْرِبْ	

فعل نہی

تعریف:۔ وہ فعل ہے جس میں کسی کام کے نہ کرنے کا حکم دیا جائے یعنی کسی کام کے کرنے سے منع کیا جائے۔

بنانے کا طریقہ:۔ مضارع معروف سے پہلے لا لگا دو اور آخر میں جزم دے دو۔ جیسے یَضْرِبُ سے لَا یَضْرِبْ۔

نون اعرابی گرا دیئے جاتے ہیں جیسے تَضْرِبَانِ سے لَا تَضْرِبَا

حرفِ علت ہو تو وہ بھی گر جاتا ہے۔ جیسے تَرْمِیْ سے لَا تَرْمِ۔

نہی مجہول بنانے کا طریقہ:۔ مضارع مجہول کے آخر میں جزم دے دو اور پہلے لا لگا دو۔

گردان نہی معروف

جنس		واحد	تثنیہ	جمع
غائب	مذکر	لَا یَضْرِبْ	لَا یَضْرِبَا	لَا یَضْرِبُوْا
	مونث	لَا تَضْرِبْ	لَا تَضْرِبَا	لَا یَضْرِبْنَ
مخاطب	مذکر	لَا تَضْرِبْ	لَا تَضْرِبَا	لَا تَضْرِبُوْا
	مونث	لَا تَضْرِبِیْ	لَا تَضْرِبَا	لَا تَضْرِبْنَ
متکلم	مذکر مونث	لَا اَضْرِبْ	لَا نَضْرِبْ	

گردان نہی مجہول

جنس		واحد	تثنیہ	جمع
غائب	مذکر	لَا یُضْرَبْ	لَا یُضْرَبَا	لَا یُضْرَبُوْا
	مونث	لَا تُضْرَبْ	لَا تُضْرَبَا	لَا یُضْرَبْنَ
مخاطب	مذکر	لَا تُضْرَبْ	لَا تُضْرَبَا	لَا تُضْرَبُوْا
	مونث	لَا تُضْرَبِیْ	لَا تُضْرَبَا	لَا تُضْرَبْنَ
متکلم	مذکر، مونث	لَا اُضْرَبْ	لَا نُضْرَبْ	

اسم فاعل:۔

تعریف:۔ وہ اسم مشتق ہے جو اس ذات کو بتاتے جس سے فعل صادر ہوا ہو یا جس کے ساتھ فعل قائم ہو۔ جیسے قَاتِلٌ یعنی وہ شخص جس کی ذات سے قتل کا فعل صادر ہو یا قَاعِدٌ وہ شخص جس کے ساتھ قُعُوْد کا قیام وتعلق ہو۔

بنانے کا طریقہ:۔ مادہ (مصدر میں حروف اصلی) کے پہلے حرف کے بعد الف بڑھا دیا جائے اور دوسرے حرف کو کسرہ دے دیا جائے جیسے ضَرْبٌ مادہ سے اسم فاعل ضَارِبٌ بنتا ہے

نوٹ:۔ اسم فاعل کے چھ صیغے ہوتے ہیں تین مذکر کے لئے اور تین مونث کے لئے۔

گردان اسم فاعل

جنس	واحد	تثنیہ	جمع
مذکر	قَاتِلٌ	قَاتِلَانِ	قَاتِلُوْنَ
مونث	قَاتِلَةٌ	قَاتِلَتَانِ	قَاتِلَاتٌ

قاعدہ:۔ ثلاثی مجرد کے ابواب سے اسم فاعل کے لئے فَاعِلٌ کا وزن مقرر ہے جیسے

- ضَرَبَ سے ضَارِبٌ
- فَتَحَ سے فَاتِحٌ
- نَصَرَ سے نَاصِرٌ
- سَمِعَ سے سَامِعٌ
- حَسِبَ سے حَاسِبٌ

* * *

لیکن باب کَرُمَ۔ یَکْرُمُ سے اسم فاعل فَعِیْلٌ کے وزن پر آتا ہے جیسے

• کَرُمَ سے کَرِیْمٌ • حَسُنَ سے حَسِیْنٌ
• شَرُفَ سے شَرِیْفٌ

ثلاثی مزید فیہ سے اسم فاعل بنانے کا طریقہ درج ذیل ہے۔

فعل مضارع معروف لیکر اس سے علامت مضارع دور کر کے میم مضموم لگا دو آخری حرف کو تنوین دے دو اور آخری سے پہلے حرف کو کسرہ دے دو۔ یہی اسم فاعل ہوگا جیسے • یُخْرِجُ سے مُخْرِجٌ • یَتَصَدَّقُ سے مُتَصَدِّقٌ
• یَنْکَسِرُ سے مُنْکَسِرٌ

اسم مفعول

تعریف :۔ وہ اسم مشتق ہے جو اس ذات کو بتائے جس پر فعل واقع ہو جیسے مَنْصُوْرٌ یعنی مدد کا فعل اس کی ذات پر واقع ہوا ہے۔

بنانے کا طریقہ :۔ مادہ (مصدر کے حروف اصلی) کے پہلے میم مفتوح داخل کیا جائے اور دوسرے حرف کے بعد واؤ بڑھا دیا جائے۔ جیسے فَتْحٌ سے مَفْتُوْحٌ ثلاثی مجرد سے اسم مفعول کا صیغہ مَفْعُوْلٌ کے وزن پر آتا ہے۔

غیر ثلاثی مجرد سے اسم مفعول بنانے کا وہی طریقہ ہے جو اسم فاعل کا ہے۔ صرف یہ فرق ہے کہ اسم فاعل میں آخری سے پہلا حرف مکسور ہوتا ہے اور اسم مفعول میں مفتوح جیسے یُدْخِلُ سے مُدْخَلٌ ۔ یُصَدِّقُ سے مُصَدَّقٌ وغیرہ

گردان اسم مفعول

جنس	واحد	تثنیہ	جمع
مذکر	مَضْرُوْبٌ	مَضْرُوْبَانِ	مَضْرُوْبُوْنَ
مونث	مَضْرُوْبَۃٌ	مَضْرُوْبَتَانِ	مَضْرُوْبَاتٌ

اسم اشارہ :

تعریف :۔ وہ اسم جس کے ذریعے کسی چیز کی طرف اشارہ کیا جائے۔ اسم اشارہ کہلاتا ہے

قاعدہ :۔ (۱) جس چیز کی طرف اشارہ کیا جائے اسے مُشَارٌ اِلَیْہ کہتے ہیں۔ اسم اشارہ اور مشار الیہ ملکر جملہ کا صرف ایک حصہ بنتے ہیں۔

۲۔ اسمائے اشارہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔

(الف) وہ جن سے نزدیک کی چیزوں کی طرف اشارہ کیا جائے انھیں اسمائے اشارہ قریب کہتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔

جنس	واحد	تثنیہ	جمع
مذکر	ھٰذا	ھٰذَانِ (حالت رفعی) ھٰذَیْنِ (حالت نصبی وجری)	ھٰؤُلاءِ
مونث	ھٰذِہٖ	ھَاتَانِ (حالت رفعی) ھَاتَیْنِ (حالت نصبی وجری)	ھٰؤُلاءِ

(ب) وہ اسمائے اشارہ جن سے دور کی چیزوں کی طرف اشارہ کیا جائے۔ انھیں اسمائے اشارہ بعید کہتے ہیں۔ اور وہ حسبِ ذیل ہیں۔

جنس	واحد	تثنیہ	جمع
مذکر	ذَالِكَ ذَاكَ	ذَانِكَ (حالت رفعی) ذَیْنِكَ (حالت نصبی وجری)	اُولٰئِكَ
مؤنث	تِلْكَ تِیكَ	تَانِكَ (حالت رفعی) تَیْنِكَ (حالت نصبی وجری)	اُولٰئِكَ

۳۔ اگر مشار الیہ مفرد اسم ہے (مرکب اضافی نہیں ہے) تو اس پر لام تعریف داخل کرنا چاہیے اس صورت میں اسم اشارہ مشار الیہ سے پہلے آئے گا جیسے ھٰذَا الطَّبِیْبُ

۴۔ اگر مشار الیہ مرکب اضافی ہو تو اسم اشارہ کو بعد میں لائیں گے۔ جیسے طَبِیْبُ الْمَلِكِ ھٰذَا (بادشاہ کا یہ حکیم)۔

اس صورت میں اسم اشارہ کو بعد میں لانے کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس کو پہلے لایا جاوے تو یہ مرکب اشاری نہیں رہے گا بلکہ اسم اشارہ مبتدا اور مشار الیہ خبر بن کر جملہ اسمیہ خبریہ بن جائیگا اس صورت میں مذکورہ بالا جملے کا مطلب یہ ہو جائے گا "یہ بادشاہ کا حکیم ہے"

۵۔ اگر جملہ اسمیہ میں اسم اشارہ کو تنہا (مشار الیہ کے بغیر) مبتدا بنانا ہو تو خبر کو نکرہ لانا چاہیے یعنی خبر معرف باللام نہ ہو جیسے ھٰذَا رَجُلٌ لیکن اگر خبر کو معرف باللام لانا ہو تو اسم اشارہ اور خبر کے درمیان ایک ضمیر منفصل لانی پڑے گی جس کا صیغہ میں اسم

اشارہ کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ جیسے ھٰذِہٖ ھِیَ الْمَرْاَۃُ۔

خبر کے مرکب اضافی ہونے کی صورت میں کسی ضمیر کے لانے کی ضرورت نہیں ہے جیسے۔ ھٰذَا خَادِمُکُمْ۔

۶۔ اسم اشارہ تذکیر و تانیث، وحدت و جمع میں اپنے مشار الیہ کے مطابق آتا ہے لیکن جمع مشار الیہ جمع مکسر ہو تو اسم اشارہ عموماً واحد مونث ہی لاتے ہیں۔ جیسے تِلْکَ الرُّسُلُ وغیرہ

مرکبِ اضافی

تعریف: اگر کسی مرکب کے دونوں جزو یا دونوں کلمات اسم ہوں اور ان میں سے ایک کا دوسرے کے ساتھ تعلق ظاہر کیا گیا ہو تو اس قسم کے مرکب کو مرکب اضافی کیا جاتا ہے اور اس باہمی تعلق کو اضافت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ غُلَامُ زَیْدٍ (زید کا غلام) اس مرکب میں چونکہ غلام کی نسبت زید کی طرف کی گئی ہے اس لئے یہ مرکب اضافی ہوا۔

قاعدہ ۱۔ جس اسم کا تعلق دوسرے اسم کے ساتھ بیان کیا گیا ہو اسے مضاف کہا جاتا ہے اوپر کی مثال میں غلام مضاف ہے۔

۲۔ جس اسم کے ساتھ تعلق ظاہر کیا گیا ہو اسے مضاف الیہ کہتے ہیں مذکورہ بالا مثال میں زید مضاف الیہ ہے۔

۳۔ اردو کے برعکس عربی میں مضاف ہمیشہ مضاف الیہ سے پہلے آتا ہے۔

۴۔ مضاف پر نہ تو لام تعریف (اَلْ) آتا ہے اور نہ تنوین۔ مضاف الیہ پر یہ دونوں آسکتے ہیں۔

۵۔ مضاف الیہ ہمیشہ مجرور رہا کرتا ہے یعنی اس کے آخری حرف پر زیر آتی ہے بشرطیکہ وہ غیر منصرف نہ ہو۔

۶۔ بعض اوقات ایک ہی مرکب میں دو یا دو سے زائد مضاف الیہ ہوتے ہیں مثلاً کِتَابُ وَلَدِ الْخَادِمِ یا بَابُ بَیْتِ طَبِیْبِ الْمَلِکِ (بادشاہ کے حکیم کے گھر کا دروازہ) اس قسم کی ترکیبوں میں سب سے پہلا اسم مضاف ہے اور سب سے آخری مضاف الیہ۔

مضاف اور مضاف الیہ کی تمام شرائط ان پر عائد ہوتی ہیں لیکن درمیان کے اسم مضاف بھی ہوتے ہیں اور مضاف الیہ بھی مثلاً پہلی مثال میں ولد کتاب کا مضاف الیہ ہے اور خادم کا مضاف چنانچہ مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے اس پر زیر ہے اور مضاف ہونے کے سبب اس پر لام تعریف یا تنوین نہیں آسکتی۔ ایسے ہی دوسری مثال کو سمجھ لیجئے۔

۷۔ چونکہ مضاف اور مضاف الیہ کا آپس میں تعلق ہوتا ہے اس لئے ان کا ایک دوسرے سے متصل رہنا ضروری ہے اور ان کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور ان کے درمیان کوئی دوسرا لفظ نہیں آ سکتا۔

اگر مضاف کی کوئی صفت بیان کرنا مقصود ہو تو اسے مضاف الیہ کے بعد لانا چاہیئے۔ جیسے غُلَامُ الْمَلِكِ الْعَاقِلُ (بادشاہ کا عقلمند غلام) یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ صفت مضاف کی ہے یا مضاف الیہ کی آپ کو صفت کے اعراب پر غور کرنا چاہیئے۔ صفت کا اعراب مضاف اور مضاف الیہ میں سے جس کے مطابق ہوگا۔ اسی کی وہ صفت ہوگی۔

۸۔ جب تثنیہ (مذکر و مونث) اور جمع مذکر سالم کے صیغے مضاف ہوں تو ان کا آخری نون جو نونِ اعرابی کہلاتا ہے گر جاتا ہے۔ چنانچہ مُسْلِمَانِ الْبَلَدِ نونِ اعرابی گرنے کے بعد مُسْلِمَا الْبَلَدِ رہ جائے گا۔ مُعَلِّمُوْنَ کی جگہ مُعَلِّمُوْ۔ رہ جائے گا۔ جیسے مُعَلِّمُوْ الْمَكْتَبِ۔

اسی طرح حالت نصبی اور جری میں نونِ اعرابی گر جائے گا۔ مثلاً رَأَيْتُ مُسْلِمَيْ مَكَّةَ (میں نے مکہ کے دو مسلمان دیکھے) اور رَأَيْتُ مُسْلِمِي مَكَّةَ (میں نے مکہ کے بہت سے مسلمان دیکھے)

مرکّب توصیفی

(۱) مرکّب توصیفی وہ مرکب ہے جس میں ایک اسم دوسرے اسم کی جو اس سے پہلے ہو صفت، مذمت یا خوبی بیان کرے۔ جیسے الملكُ العادِلُ (منصف بادشاہ) اس جملے میں لفظ عادل لفظ الملك کی صفت بیان کر رہا ہے۔

(۲) جس اسم کی صفت بیان کی جائے اسے موصوف کہتے ہیں۔ اور صفت بیان کرنے والے اسم کو صفت کہا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا مثال میں الملكُ موصوف ہے اور عادل صفت۔

(۳) اردو اور انگریزی کے برعکس عربی میں موصوف پہلے آتا ہے اور صفت اس کے بعد آتی ہے جیسے۔ الولد العاقل

(۴) مرکب توصیفی کے دونوں اجزاء یا تو معرفہ ہوں گے جیسا کہ اوپر کی مثال میں یا پھر دونوں نکرہ ہوں گے جیسے رَجُلٌ عَالِمٌ (ایک عالم آدمی)

(۵) صفت اور موصوف تذکیر و تانیث میں ایک دوسرے کے مطابق ہوں گے۔ جیسے رَجُلٌ

صالحٌ (ایک نیک آدمی) المراۃُ الصالحۃُ (نیک عورت)

(۶) وحدت، تثنیہ اور جمع میں بھی صفت اپنے موصوف کے مطابق ہوتی ہے۔

رجلٌ عالمٌ۔ رجلانِ عالمانِ۔ رجالٌ عالمونَ۔ امراۃٌ عالمۃٌ۔

امراتانِ عالمتانِ۔ نساءٌ عالماتٌ

لیکن اگر موصوف اسم غیر عاقل کی جمع ہو خواہ مذکر ہو یا مونث تو صفت عموماً واحد مونث ہی آتی ہے۔ جیسے اشجارٌ طویلۃٌ۔ حیواناتٌ کبیرۃٌ۔ انہارٌ جاریۃٌ

(۷) حالت اعرابی میں صفت اپنے موصوف کے مطابق آتی ہے۔ یعنی جو حالت اعرابی موصوف کی ہوگی وہی صفت کی ہوگی۔ جیسے جاءَ رجلٌ عالمٌ۔ رایتُ رجلاً عالِماً۔

(۸) مرکب توصیفی بھی جملہ کا ایک حصہ ہی ہوتا ہے۔ نہ کہ مکمل جملہ لیکن اس کے ساتھ خبر یا فعل لگ کر اس کو مکمل جملہ بناتا ہے۔ جیسے جاءَ رجلٌ عالمٌ۔ الولدُ العاقلُ صالحٌ

(۹) اگر مضاف کی صفت لانا مقصود ہو تو وہ مضاف الیہ کے بعد آئے گی۔ مثلاً غلامُ الملکِ العاقلُ۔ (بادشاہ کا عقلمند غلام)

اَبٌ۔ اَخٌ۔ حَمٌ۔ ذُوٌ اور فَمٌ جب ضمیر واحد متکلم (ي) کے علاوہ کسی اور ضمیر یا اسم کی طرف مضاف ہوں گے تو ان کی مندرجہ ذیل صورت ہوگی۔

حالت رفعی	حالت نصبی	حالت جری
أَبُوْ	أَبَا	أَبِيْ
أَخُوْ	أَخَا	أَخِيْ
حَمُوْ	حَمَا	حَمِيْ
فُوْ	فَا	فِيْ
ذُوْ	ذَا	ذِيْ

مثلاً جَاءَ أَبُوْ خَالِدٍ۔ رَأَيتُ أَبَا خَالِدٍ۔ كَتَبْتُ إِلىٰ أَبِيْ خَالِدٍ

اور اگر ضمیر متکلم (ی) کی طرف مضاف ہوں تو رفع۔ نصب اور جر تینوں حالتوں میں ظاہری الفاظ کے اعتبار سے یکساں رہتے ہیں۔ مثلاً:

هُوَ أَبِيْ۔ رَأَيْتُ أَبِيْ۔ مَرَرْتُ بِأَبِيْ۔

(۱۰) اگر حرف ندا کے بعد مرکب اضافی آئے یعنی منادی مرکب اضافی ہو تو مضاف کو مرفوع

کی بجائے منصوب پڑھا جاتا ہے۔ جیسے یَا عَبْدَ اللّٰہِ ۔ یَا خَادِمَ الْمَلِکِ ۔

(۱۱) اگر دو یا زیادہ اسموں کو ایک اسم کی طرف منسوب کرنا ہو تو ایک کو مضاف بنا کر مضاف الیہ پہلے رکھیں گے اور دوسرے و تیسرے کو حرف عطف کے بعد لائیں گے جو مضاف الیہ کی طرف راجع ہو گی۔ مثلاً قَلَمُ التِّلْمِیْذِ وَ قِرْطَاسُہٗ وَ کِتَابُہٗ (شاگرد کا قلم، کاغذ اور کتاب)

جملہ اسمیہ

(۱) ایسا فقرہ جس کا پہلا جزو اسم ہو اُسے جملہ اسمیہ کہتے ہیں۔

(۲) جملہ اسمیہ کے پہلے جزو کو مبتدا اور دوسرے کو خبر کہا جاتا ہے۔ مثلاً خَالِدٌ قَائِمٌ میں خَالِدٌ مبتدا ہے اور قَائِمٌ خبر ہے

(۳) مبتدا عموماً معرفہ ہوتا ہے اور خبر نکرہ جیسا کہ اوپر والی مثال سے ظاہر ہے۔ کیونکہ اگر دونوں جزو نکرہ ہوں یا دونوں معرفہ ہوں تو جملہ اسمیہ رہے گا ہی نہیں بلکہ مرکب توصیفی بن جائے گا۔ جیسے۔ رَجُلٌ قَائِمٌ یا الرَّجُلُ القَائِمُ۔

(۴) مبتدا اور خبر دونوں مرفوع ہوتے ہیں۔

(۵) وحدت۔ تثنیہ اور جمع ہونے میں اور تذکیر و تانیث میں خبر کا مبتدا کے مطابق آنا ضروری ہے۔ جیسے۔ الرَّجُلُ عَالِمٌ۔ الرَّجُلَانِ عَالِمَانِ۔ الرِّجَالُ عَالِمُوْنَ۔ المَرْأَۃُ عَالِمَۃٌ۔ المَرْأَتَانِ عَالِمَتَانِ۔ النِّسَاءُ عَالِمَاتٌ۔

لیکن اگر مبتدا غیر عاقل (مذکر ہو یا مونث) کی جمع ہو تو خبر عام طور پر واحد مونث لائی جاتی ہے۔ جیسے الحَیَوَانَاتُ کَبِیْرَۃٌ۔ الاَشْجَارُ طَوِیْلَۃٌ۔ الحُرُوْبُ مُہْلِکَۃٌ

(۶) مبتدا اور خبر کبھی دونوں مفرد ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر کی مثالوں میں گزر چکا ہے لیکن بعض اوقات ان میں سے ایک مفرد ہوتا ہے اور دوسرا مرکب۔ جیسے۔ الرَّجُلُ العَالِمُ حَاضِرٌ۔ (عالم آدمی حاضر ہے) یہاں مبتدا مرکب ہے۔ اور خبر مفرد۔ المَلِکُ عَالِمٌ صَالِحٌ (بادشاہ عالم اور نیک ہے۔) مبتدا مفرد ہے اور خبر مرکب ہے۔

(۷) جملہ اسمیہ میں اگر نفی کے معنی پیدا کرنے مقصود ہوں تو جملہ کے شروع میں مبتدا سے پہلے مَا یا لَیْسَ لگا دیتے ہیں۔ اس صورت میں خبر کا منصوب لانا ضروری ہے۔ جیسے مَا زَیْدٌ جَاہِلاً (زید جاہل نہیں ہے) لَیْسَ المَلِکُ ظَالِمًا (بادشاہ ظالم نہیں ہے)

لیکن جملہ اسمیہ میں ما یا لیس داخل کرنے سے عام طور پر خبر کے ساتھ ب لگادی جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے خبر مجرور آتی ہے۔ جیسے ما زیدٌ بجاھلٍ۔ (زید جاہل نہیں ہے) لیس اللّٰہُ بغافلٍ عمّا تعملوْن (جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے)

(۸) اگر جملہ اسمیہ کے قبل اِنَّ یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی حرف داخل ہو تو اس کی وجہ سے مبتدا مرفوع کی بجائے منصوب آتا ہے جیسے اِنَّ زیدًا قائمٌ (بیشک زید کھڑا ہے)۔

اس صورت میں اسم منصوب کو بجائے مبتدا اسم اِنَّ کہتے ہیں۔

اخوات اِنّ یا اِنّ کے ساتھی مندرجہ ذیل ہیں۔

اِنّ ۔ کانّ ۔ لیتَ ۔ لکنّ ۔ لعلّ

(۹) بعض اوقات خبر بجائے خود ایک جملہ ہوتی ہے۔ اگر خبر جملہ ہو (اسمیہ یا فعلیہ) تو اس میں کوئی ایسا ضمیر ہونا چاہیئے جو مبتدا کی طرف لوٹنے والا ہو۔ اس ضمیر کا مبتدا کے مطابق آنا ضروری ہے۔ جیسے زیدٌ ضربَ (زید نے مارا)۔ اس میں ضمیر ہُوَ مستتر ہے جو زید کی طرف راجع ہے۔ زیدٌ ابوہٗ قائمٌ (زید کا باپ کھڑا ہے)۔ ابوہٗ کی ضمیر زید کی طرف راجع ہے۔

(۱۰) اگر مبتدا دو ہوں جن میں سے ایک مذکر اور دوسرا مونث تو خبر مذکر کے مطابق آئے گی۔ تذکیر و تانیث میں جیسے: الملکُ والملکۃ صالحانِ (بادشاہ اور بیگم نیک ہیں)

(۱۱) مندرجہ ذیل صورت میں خبر کو مبتدا سے پہلے لانا ضروری ہے۔

جب کہ مبتدا نکرہ ہو اور خبر ظرف یا جار مجرور ہو۔ جیسے: عندی کتابٌ۔ فی السوقِ تاجرٌ

(۱۲) اگر مبتدا میں شرط کا معنی پایا جائے تو خبر پر ف لائی جاسکتی ہے۔ جیسے من ظلم فعلیہ وزرہٗ۔ جو کوئی ظلم کرے گا اس پر ہی اس کا بوجھ ہوگا۔

(۱۳) بعض اوقات کسی قرینہ کی موجودگی کی بنا پر مبتدا یا خبر کو حذف بھی کردیا جاتا ہے جیسے صدیقی واللہ۔ خدا کی قسم یہ میرا دوست ہے۔ یہاں ھٰذا مبتدا محذوف ہے۔ دخلتُ فاذا المرأۃ۔ میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عورت بیٹھی ہے۔ اس جگہ جالسۃٌ خبر محذوف ہے۔

جملہ فعلیہ

جس جملے کا پہلا جزو فعل ہو اسے جملہ فعلیہ کہا جاتا ہے۔ جیسے ذھب خالدٌ

جملہ فعلیہ ہے۔ اس جملہ میں ذھب فعل ہے اور اسے مسند بھی کہا جاتا ہے۔ خالدٌ فاعل ہے اسے مسند الیہ بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ فعل کی نسبت اُس کی طرف ہوتی ہے۔ اردو اور انگریزی کے برعکس عربی زبان میں فعل پہلے آتا ہے اور فاعل بعد میں۔

فعل دو قسم کا ہوتا ہے لازم اور متعدی۔

فعل لازم:۔ فعل لازم وہ فعل ہے جو صرف فاعل کو چاہیئے یعنی اگر فاعل اس کے ساتھ لگ لگ جائے تو پورا جملہ بن جائے اور مطلب واضح ہو جائے۔ جیسے جاءَ زیدٌ (زید آیا)۔

فعل متعدی:۔ وہ فعل ہے جو فاعل کے علاوہ مفعول کو بھی چاہیئے یعنی فقط فاعل کے ملنے سے تمام جملہ پورا نہ ہوا اور مطلب اچھی طرح واضح نہ ہوا۔ اور سامع کو کسی اور چیز کے حصول کی طلب ہے۔ مثلاً اکل الرجلُ (آدمی نے کھائی) کہا جائے تو جملہ نامکمل رہتا ہے۔ اور سامع کو اس بات کی ٹوہ رہتی ہے کہ آدمی نے کیا کھایا۔ چنانچہ جب اکل الرجلُ خبزاً کہا جاتا ہے تو سامع کی طلب جاتی رہتی ہے اور اُسے پتا چل جاتا ہے کہ آدمی نے روٹی کھائی پس فعل متعدی وہ فعل ہوا جو فاعل کے علاوہ مفعول کو بھی چاہیئے۔ اور اس مفعول کو مفعول بہ کہا جاتا ہے۔ مفعول بہ ہمیشہ منصوب ہوتا ہے۔

(۳) فعل متعدی تین قسم کا ہوتا ہے۔

(الف) وہ فعل متعدی جو صرف ایک مفعول کو چاہیئے۔ جیسے کتب التلمیذ المکتوبَ۔ (شاگرد نے خط لکھا) ضربَ المعلمُ الولدَ (استاد نے لڑکے کو مارا)۔

(ب) وہ فعل متعدی جس کے عموماً دو مفعول ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اگر ایک مفعول پر اکتفا کیا جائے اور دوسرا ذکر نہ بھی ہو تو کام چل سکتا ہے۔ جیسے اعطیتُ درھماً۔ یا اعطیتُ اسائلِ۔

اور کبھی دونوں مفعولوں کا ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے:۔ وجدت العلم نافعاً۔ (میں نے علم کو مفید پایا۔)

حسبت الماء باردًا۔ (میں نے پانی کو ٹھنڈا گمان کیا۔)

(ج) وہ فعل متعدی جس کے تین مفعول آتے ہیں جیسے: اخبرتُ التلامذۃ اللعبَ نافعاً۔ (میں نے طالب علموں کو کھیل کے مفید ہونے کی خبر دی۔) اعلمتُ خالداً بکراً عالِماً۔ (میں نے خالد کو بکر کے عالم ہونے کا علم دیا۔)

(۴) فعل لازم کو متعدی بنانے کے قواعد درج ذیل ہیں۔

(الف) کبھی تو صرف حرف باء (ب) کے اضافے سے فعل لازم متعدی بن جاتا ہے۔

جیسے ذَهَبْتُ (میں گیا) سے ذَهَبْتُ بِزَيْدٍ (میں زید کو لے گیا۔)

آتیٰ خَالِدٌ (خالد آیا) سے آتیٰ خَالِدٌ بِمَاءٍ (خالد پانی لایا)۔

(ب) بعض اوقات فعل لازم سے پہلے ہمزہ (الف) لگانے سے فعل متعدی بن جاتا ہے۔ جیسے: دَخَلَ زَيْدٌ۔ (زید داخل ہوا) سے اَدْخَلَ زَيْدٌ (زید نے داخل کیا)۔

جَلَسَ حَامِدٌ (حامد بیٹھا) سے اَجْلَسَ حَامِدٌ خَالِدًا (حامد نے خالد کو بٹھایا)

(ج) بعض اوقات فعل لازم کے عین کلمہ۔ درمیانی حرف پر تشدید دینے سے ہی فعل متعدی بن جاتا ہے۔ جیسے: صَدَقَ الرَّجُلُ۔ (آدمی نے سچ کہا) صَدَّقَ الرَّجُلُ الْوَلَدَ (آدمی نے لڑکے کو سچا جانا)۔

نَزَلَ الْقُرْآنُ (قرآن اترا) سے نَزَّلَ اللّٰہُ الْقُرْآنَ۔ (اللہ نے قرآن نازل کیا)۔

پرچه چهارم

آریامت کی مذہبی کتب

آریا جب شروع میں ہندوستان سے آئے تو ان کے مذہبی تصورات بہت سادہ تھے۔ اور ان ہی عقائد اور تصورات کو ویدوں میں لکھا گیا۔

یہ ویدیں زیادہ تر مذہبی اور معاشرتی اشعار پر بنی ہیں، ان میں کہیں تو خوفناک چیزوں سے انسان کو ڈرایا گیا اور کہیں محبت کے اشعار ہیں۔ ان ویدوں کا مقصد اپنے پیروں کو مذہبی عبادات رسم و رواج اور دیوتاؤں کو خوش رکھنے کے مختلف منتر اور ٹوٹکوں کی تعلیم دینا ہے۔ ویدک مذہب میں ہر اس چیز کو معبود قرار دیا جاتا ہے جس سے انسانی ذہن پر خوف طاری ہو جائے۔ یعنی زمین آسمان، پہاڑ، دریا وغیرہ عبادت کے قابل تھے۔

ویدیں

لفظ وید، 'ود' سے نکلا ہے جس کے معنی جاننے اور علم کے ہیں اس لئے وید کے اطلاق عام علوم یا اخذ کیے ہوئے علم پر ہوتا ہے۔ آریاؤں کے عقائد کو ویدوں میں مدون کیا گیا۔ ویدوں کی تعلیمات پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

ویدک مقدس اور ارواح پرستی:

ویدک مقدس کی ایک اور خصوصیت ارواح پرستی تھی۔ یعنی کائنات میں لاتعداد طاقتیں کارفرما ہیں جو کہ جنگلوں، پہاڑوں، دریاؤں اور بڑے بڑے درختوں کو اپنا مسکن بناتی ہیں۔ ان میں خیر کی نسبت شر کی صلاحیت زیادہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ انہیں راضی رکھا جائے۔

عقیدہ تجسّم:

کچھ عرصہ بعد ہندوؤں میں عقیدہ تجسّم نے زور پکڑا اور شخصی دیوتاؤں کا عقیدہ رائج ہوا تو ان روحوں کو زندگی کے مختلف شعبوں کا دیوتا بنایا گیا اور ان کے نام پر مختلف مندر تعمیر ہونے لگے۔

ویدوں کی تدوین:

ویدوں کی تدوین کے زمانے کی تعین کے بارے میں مختلف خیالات ہیں۔ قیاس ہے کہ جب آریا

ہندوستان میں داخل ہوئے تو کچھ مذہبی بھجن اور گیت انھیں یاد تھے۔ کچھ دنوں تک وہ انھیں زبانی منتقل کرتے رہے پھر جب فن تحریر سے آگاہ ہوئے تو انھیں قلم بند کیا۔

ویدوں کی تعداد

ویدوں کی تعداد کل چار ہے (۱) رگ وید (۲) سام وید (۳) یجر وید (۴) اتھر وید

۱۔ رگ وید:۔

ویدوں میں قدیم ترین رگ وید ہے اس کے منتروں کا مجموعہ ۱۰۰۰ سے زائد اشلوکوں پر مشتمل ہے۔ یہ منتر زیادہ تر مناجات اور حمد کی شکل میں ہیں۔ ان میں بہت سے معبودوں کے نام ہیں جن کو مخاطب کر کے دولت اور عزت طلب کی جاتی تھی۔ اور فتح و کامرانی کی دعائیں کی گئی ہیں وہ منتر جو پوستا کی شان میں ہیں وہ بہت ہی دلکش ہیں۔ ان بھجنوں میں رنگین خرافات بھی ملتے ہیں جس سے ان کی ذہنی پستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے زیادہ تر حصے ابتک ناقابل فہم ہیں۔

۲۔ سام وید:۔

قدامت کے لحاظ سے رگ وید کے بعد سام وید کا نمبر آتا ہے اس کے تمام منتر سوائے ۷۵ اشلوکوں کے رگ وید سے ماخوذ ہیں۔ ان منتروں کو یہاں اکٹھا کیا گیا ہے تاکہ رسموں کی ادائیگی میں آسانی ہو۔ تاکہ مخصوص رسم کے لئے انھیں آسانی سے تلاش کیا جا سکے۔ یہ کتاب رسم ورواج کی ادائیگی میں رہنمائی کرتی ہے۔ اس لئے اس کا نام سام ہے۔ سام ہندی کا لفظ ہے۔

۳۔ یجر وید:۔

سام وید کی طرح یجر وید کے منتر بھی رگ وید سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے ایک کو سیاہ یجر اور دوسری کو سفید یجر کہتے ہیں۔ یہ کتاب مذہبی رہنماؤں کے لئے گائیڈ کی حیثیت رکھتی ہے اور مختلف مذہبی امور کے انجام دینے میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

۴۔ اتھر وید:۔

قدامت کے لحاظ سے اس کتاب کا نام سب سے آخر میں آتا ہے۔ اس کی تصنیف بہت بعد میں ہوئی۔ لیکن اس کے بعض حصے رگ وید سے بھی زیادہ قدیم معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے زیادہ تر منتر جادو ٹونے سحر اور جھاڑ پھونک سے متعلق ہیں۔ ان میں بھوتوں کا بھی تخیل ہر جگہ موجود ہے

نیز بھوتوں کی پرستش کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس میں رگ وید کے منتر بہت کم ہیں۔

الغرض رائج العقیدہ ہندوؤں کا خیال ہے کہ تمام ویدی ادب الہامی ہے اور یہ پرمیشور کے خاص بندوں کے ذریعے پہنچائے گئے ہیں اور برہما نے انھیں اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے مگر یہ خاص بندے کون تھے۔ معلوم نہیں۔

ویدوں کے راگوں میں وحدانیت کا تصور بھی ملتا ہے۔ کیونکہ ان میں یہ خیال موجود ہے کہ مختلف دیوتا اور دیویاں ہستی واحد کے مظاہر ہیں۔ ویدک عہد کے اختتام پر برہما کی مذہبی کتب 'پراجپتی' کو تمام دیوتاؤں اور دیویوں کا سردار اور باپ تسلیم کیا گیا ہے۔

ہندو مت میں ذات پات کا نظام

تعریف :-

دنیا کے مذاہب میں ہندو مت کا نام بھی شامل ہے۔ ہندو مذہب کی تحریک ۲۰۰۰ سال قبل مسیح سے شروع ہوتی ہے۔ موہن جوڈارو اور ہڑپا میں اس کے اثرات پائے جاتے ہیں۔
جب آریائی ہندوستان میں داخل ہوئے تو یہاں کے مقامی باشندوں سے بہتر تھے جس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے ہندوستان کے تمام باشندوں کو اپنا محکوم بنا لیا اور آریائی اقتدار کی بنیاد رکھی اور اس اقتدار کو مضبوط بنانے کے لئے سب سے زیادہ فائدہ تناسخ کے فلسفے سے اٹھایا گیا جس کی وجہ سے ہندوستان کی تمام غیر آریائی نسلیں اپنے پہلے جنم میں کئے ہوئے گناہ کی سزا میں ذلیل رہیں گے۔ ذات پات کا ذکر ہندوؤں کی مشہور کتاب 'منو سمرتی' کی روشنی میں -

ہندو مذہب اور ذات پات :-

ہندو مذہب کے عقیدے کے مطابق جب خالق نے کائنات کو بنایا تو اس کا کاروبار چلانے کے لئے چار ذاتیں پیدا کیں (۱) برہمن کو خالق نے اپنے منہ سے پیدا کیا (۲) کھشتری کو بازو سے (۳) ویش کو ران سے (۴) شودر کو پاؤں سے ۔

ذاتیں اور ان کے فرائض :-

خالق نے ان چار مختلف ذاتوں کو پیدا کر کے ان کو الگ الگ خدمات سپرد کیں ۔

(۱) برہمن کا کام پڑھنا پڑھانا اور مذہبی رسومات کی حفاظت ہے ۔

(۲) کھشتری کا کام حکومت کرنا۔ وید پڑھنا اور دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا ۔

(۳) ویش کا کام تجارت اور زراعت کرنا اور وید پڑھنا۔

(۴) شودر کے لئے ان تینوں ذاتوں کی تن من دھن سے خدمت کرنا ۔

ان چاروں ذاتوں کی پیدائش اور تقسیم کار کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس مذہب میں

شودر کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور اس کی حقیقت ہندوؤں کے ان نکات سے ملتی ہے ۔

(۱) برہمن کھشتری اور ویش اس ملک میں حاکم بن کر رہیں اور اگر شودر تنگی میں ہوں تو ملک چھوڑ دیں

(۲) برہمن کے نام کے ساتھ خوشی کا لفظ، کھشتری کے ساتھ طاقت کا اور ویش کے ساتھ مال و دولت کا لفظ شامل ہونا چاہئے اور شودر کے ساتھ حقارت کا لفظ ہو ۔

(۳) شودر لوگ سور اور کتے کی طرح ہیں۔ لہٰذا جب برہمن کھانا کھائیں تو شودر کی ان پر نظر نہ پڑے ۔

(۴) برہمن کا جھوٹا شودر کی غذا ہے ۔

(۵) شودر کو مذہب اور عبادت کی تعلیم دینے والا دوزخ میں جائے گا ۔

(۶) اگر شودر چھپ کر وید کو سن لے تو اس کے کان میں سیسہ ڈال دیا جائے گا ۔

(۷) اگر شودر کسی ذات والے کے پاس بیٹھ جائے یا برابر بیٹھ جائے تو اس کی کمر داغ دی جائے

(۸) برہمن، کھشتری اور ویش کا دوسرا جنم ہے اور شودر کا پہلا اس لئے یہ ذلیل رہے گا ۔

(۹) برہمن اگر شودر کو قتل کر دے تو بس تھوڑا سا جرمانہ دینا کافی ہے ۔

الغرض ہندو معاشرت میں ذات پات کی تقسیم شودر کو عہد فرعون کے بنی اسرائیل سے بھی بدتر درجہ دیتی ہے ۔

مہابھارت اور رامائن

مہابھارت اور رامائن نئی برہمنیت کی ادبی تخلیقات ہیں اور انھیں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ لہٰذا ان دونوں پر بحث کی جاتی ہے۔

مہابھارت۔

مہابھارت میں کوروں اور پانڈوں کی جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ آریاؤں کے دو بڑے گروہ تھے جو بیرون ملک سے آکر ہندوستان میں مقیم ہو گئے تھے۔

پانڈوں کا علاقہ ہمالیہ کے دامن کا علاقہ تھا اور ان کا دیوتا کرشنا تھا جو دراصل ایک قومی لیڈر تھا جس نے برہمنوں کے مقابلے میں ایک نیا مذہب قائم کیا جو ایک حد تک وحدانیت پر مبنی تھا جب کہ کوروں کا گروہ جو کہ پانڈوں سے بعد میں ہندوستان میں داخل ہوئے برہمنوں کا حامی تھا،

اس جنگ میں پانڈوں کو فتح حاصل ہوئی لیکن مذہبی بالادستی پھر بھی برہمنوں کو حاصل رہی۔

مہابھارت اور بھگوت گیتا۔

بھگوت گیتا مہابھارت کا سب سے اہم حصہ ہے جسے مذہبی نقطۂ نظر سے نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ اس میں کرشنا کی شخصیت کو خدائی کا مظہر مانا گیا ہے۔

اکثر مورخین کے نزدیک کرشنا ایک غیر برہمن جنگجو نسل کا راہنما تھا۔ یہ نہ صرف ایک زبردست سپاہی تھا بلکہ ایک قومی مذہب کا بانی بھی تھا جو ویدوں سے قطعی مختلف تھا اور اس کا عقیدہ توحید سے ملتا جلتا تھا جس میں اخلاقی تعلیمات پر زور دیا گیا تھا اور اس کے ماننے والے "بھگوتیا" کہلاتے تھے۔

اگرچہ بھگوت گیتا ابتدا میں اسی مذہب کی کتاب تھی لیکن بعد ازاں اسے برہمنی نظام میں وہی اہمیت حاصل ہو گئی جو عیسائیوں میں عہد نامہ جدید کو حاصل ہے۔ بھگوت گیتا اب اپنی اصلی صورت میں موجود نہیں بلکہ اس میں کافی تحریف کی جا چکی ہے۔

کرشنا بھگوت گیتا میں پہلے اپنے آپ کو انسانی صورت میں ایک شخصی خدا کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اور پھر ایک مافوق الفطرت ہستی کا روپ دھار لیتا ہے اور اپنے پیروؤں کو یقین

دلاتا ہے کہ مرنے کے بعد انھیں اس کا قرب حاصل ہوگا ۔

اس طرح کرشنا اپنے آپ کو دو متضاد روپوں میں پیش کرتا ہے ۔

بھگوت گیتا اور تصور خدا ۔

بھگوت گیتا میں خدا کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کے تحت وہ ایک ذی شعور ابدی اور طاقتور ہستی ہے ۔ جو ازل سے موجود ہے ۔ وہ نہ صرف اس دنیا سے الگ حیثیت رکھتی ہے بلکہ انسانوں کی لافانی روح سے بھی بالکل جدا ہے ۔ وہ روح تو ہے لیکن ایسی روح نہیں جو انسانوں میں پائی جاتی ہے ۔

گیتا کی تعلیمات کے مطابق خدا کی دو فطرتیں ہیں ایک ادنیٰ اور دوسری اعلیٰ ۔ ایک فطرت اعلیٰ روحانی طاقت ہے جس پر کائنات کے قیام کا دارومدار ہے اور دوسری فطرت کا تعلق مادے سے ہے ۔ گیتا میں زندگی گزارنے کے لئے دو قسم کی تعلیم دی گئی ہے ۔

۱ ۔ دنیا سے الگ تھلگ رہ کر علم کی تلاش میں مصروف ہو جانا ۔

۲ ۔ دنیا کے کاروبار میں رہتے ہوئے اور زندگی کے فرائض بجالاتے ہوئے ادنیٰ خواہشات کو ترک کر دینا ۔

گیتا میں نجات اور فلاح کے لئے دوسرے طریقہ کو پسند کیا گیا ہے ۔ گیتا میں نہ صرف مذہبی رسومات کی مذمت کی گئی ہے بلکہ قربانیوں کو ترک کر دینے پر بھی ابھارا گیا ہے ۔ موت کے بعد کے متعلق گیتا کا تصور یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد خدا کے حضور اپنا انفرادی شعور قائم رکھتا ہے ۔

رامائن ۔

رامائن دراصل مغربی بنگال اور بہار کے سکونت پذیروں کی مذہبی روایات کی آئینہ دار ہے یہ کتاب تقریباً ۲۰ ہزار اشلوکوں پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب کا ایک بڑا حصہ ہندوؤں کے شاعر "والمیک" کی تصنیف ہے ۔ جس میں رام چندر کے واقعات شامل ہیں ۔

رام چندر راجہ دسرتھ کا بیٹا تھا جو اپنے سوتیلے بھائیوں کے مقابلہ میں زیادہ عقلمند اور بہادر تھا چنانچہ بادشاہ نے جب اسے ولیعہد بنایا تو اس کی سوتیلی ماں نے اپنے ایک بیٹے کو تخت پر

بٹھا کر اسے جلا وطن کر دیا۔

رامائن اور دسہرا:

رام چندر کی جلا وطنی کے زمانہ میں اسکے بھائی لکشمن اور بیوی سیتا نے سخت مشکلات کے وقت بھی رام چندر کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جلا وطنی کے زمانے میں جب لنکا کے راجہ نے اسکی بیوی کو اغوا کر لیا تو رام چندر نے اس کی بازیابی کے لئے لنکا کے راجہ سے جنگ کی اور اسے شکست دی۔ چنانچہ ہندوؤں میں دسہرا کا تہوار اسی فاتحانہ مقابلہ کی یاد میں نہایت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔

رامائن کا ہر کردار مثالی اخلاق رکھتا ہے۔ رام چندر کو وشنو کا اوتار تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی حیثیت سے انکی پوجا بھی کی جاتی ہے۔

بدھ مت

گوتم بدھ کا تعارف :

آپ کا نام سدھارتھ تھا اور ساکیامنی خاندان میں پیدا ہوئے ۔ آپ کا بچپن شاہی خاندان کے فرد کی حیثیت سے گزرا ۔ آپ ابتدا ہی سے سوچ وبچار کے عادی تھے ۔ دنیاوی کاروبار میں آپ کا دل نہیں لگتا تھا ۔ چنانچہ آپ کی شادی کے بعد بھی آپ کی زندگی میں کوئی فرق نہ آیا ۔

آپ نے جب ایک مریض ، ایک بوڑھے اور ایک میت کو دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ دنیا مصیبتوں کا گھر ہے اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے ۔ لہٰذا آپ نے گھر بار چھوڑ کر جنگلوں کی راہ لی ۔ مختلف مقامات پر رہ کر ہندوانہ طریقہ سے عبادت کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہا لیکن اس نتیجے پر پہنچے کہ جس چیز کی مجھے تلاش ہے وہ درحقیقت میرے اندر ہی پنہاں ہے ۔ چنانچہ آپ نے مراقبہ اور دھیان کا سہارا لیا اور یہ طے کر لیا کہ جب تک حقیقت کو نہ پالوں پیپل یا بڑ کے درخت کے نیچے بیٹھا رہوں گا ۔ اور آخر کار مسلسل غور وفکر کے بعد آپ پر یہ راز کھلا کہ نیک اور عمدہ طرز عمل ہی انسان کے اس دنیاوی مسائل کا حل ہے ۔ اس کے بعد بدھ نے مختلف مقامات کا سفر کیا اور تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا ۔

گوتم بدھ نے جس مذہب کو پیش کیا اس میں ذات پات اور الوہی دیوتاؤں کے پوجا کی کوئی گنجائش نہ تھی ۔

بدھ کے چار بنیادی حقائق :

گوتم بدھ نے اپنے عقائد کی بنیاد جن چار حقیقتوں پر رکھی وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) دنیاوی مصیبت (۲) دنیاوی مصیبت کی جڑ (۳) دنیاوی مصیبت کو معلوم کرنے کا طریقہ (۴) دنیاوی مصیبت کا معلوم ہو جانا ۔

ان چاروں حقیقتوں پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ گوتم بدھ دراصل تقدیر انسانی پر یقین رکھتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ رہبانہ تصورات اور اپنے آپ کو قربان کر دینے کا نمایاں جذبہ اور ان کے نتیجے میں دنیوی راحت نے بدھ کے دل و دماغ کو مسخر کر لیا تھا ۔ وہ اس بات کا قائل

تھا کہ انسان چاہے کتنی مسرت اور کیسی ہی خوشیاں پھیلانے کی کوشش کرے۔ ہر قسم کی معاشرتی ناانصافی کو ختم کرنے کے لئے تگ و دو کرے اطمینان قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔

زندگی کی اعلیٰ صداقتیں

بدھ مت نے چار بنیادی حقیقتوں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی چار اعلیٰ صداقتوں سے بھی روشناس کرایا۔ اور وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) زندگی مجسم دکھ ہے۔

(۲) زندگی کے دکھوں کا سبب نفسیاتی خواہشات ہیں۔

(۳) نفسیاتی خواہشات سے بچنا ضروری بھی ہے اور ممکن بھی۔

(۴) ان خواہشات سے بچنے کے لئے مشکل تر ریاضت کی ضرورت نہیں۔ بلکہ میانہ روی سے ان پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اور اس راستے کو اختیار کرنے کے لئے بدھ مت نے آٹھ اصول مقرر کر لئے۔

(۱) صحیح علم اور عقیدہ (۲) صحیح ارادہ (۳) صحیح کلام (۴) صحیح عمل (۵) صحیح سلوک (۶) صحیح جدوجہد (۷) صحیح یادداشت (۸) صحیح غور و فکر۔

ان آٹھوں اصولوں کو حاصل کرنے کے لئے چار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

(۱) پہلا مرحلہ۔ جب انسان اس بات کا عہد کرے کہ وہ بدھ مت کو اپنائے گا تو اس کی کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ خواہ وہ ایک بار یا ایک سے زیادہ جنم میں حاصل ہو۔

(۲) دوسرا مرحلہ۔ جب انسان آخری جنم سے پہلے ایک جنم لیتا ہے تو اس جنم میں بہت سے فاسد خیالات دور ہو جاتے ہیں۔

(۳) تیسرا مرحلہ۔ اس منزل پر پہنچ کر باقی ماندہ فاسد خیالات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اور انسان زندگی اور موت کے آخری چکر میں داخل ہوتا ہے۔

(۴) چوتھا مرحلہ۔ اس مرحلہ کو بدھ مت کی مذہبی زبان میں ارہت کہتے ہیں۔ یعنی یہ وہ مرحلہ ہے جہاں انسان مصیبتوں سے آشنا ہو کر نروان حاصل کر لیتا ہے۔

جو لوگ اس راہ پر چلنا چاہیں۔ بدھ مت ان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ شہری زندگی کو چھوڑ دیں

گھر خاندان اہل و عیال سماج اور اپنے پیشہ تک کو ترک کردیں۔ اور طارق الدنیا لوگوں میں شامل ہو جائیں۔ اپنے خوراک لباس اور عادات میں سادگی اختیار کریں۔ غرض یہ کہ آبادی سے بالکل الگ تھلک ہو جائیں۔ سر اور داڑھی کو منڈوا دیا جائے۔ خوراک بھیک مانگ کر حاصل کی جائے اور وہ بھی صبح کے وقت۔ بیمار اور روگی اشخاص اس مذہب میں داخل نہیں ہو سکتے۔ البتہ ذات پات کا کوئی امتیاز نہیں۔ مذہب کے ماننے والوں کو بھکشو کہتے ہیں اور ہر بھکشو کے لئے ضروری ہے کہ وہ حسب ذیل امور کا مرتکب نہ ہو گا۔ اور ہر صورت میں ان سے بچنا پڑے گا۔

خاندان کا قتل۔ چوری کا ارتکاب۔ آرام دہ جگہوں پر نہ بیٹھنا نہ سونا، نیز سونے اور چاندی کے قریب نہ جانا۔ ان تمام چیزوں پر عمل کرتے ہوئے انسان اطمینان قلب حاصل کر لیتا ہے۔ اور یہی نروان ہے۔

بدھ مت کی مذہبی کتب

بدھ مت کی ابتدائی تعلیم اخلاقیات پر مبنی تھی جو کہ گوتم بدھ کے اقوال کی صورت میں سینہ بہ سینہ چلتی رہی۔ یہاں تک کہ بدھ کے انتقال کے (۲۰۰) دو سو برس بعد ان کی تعلیمات کو تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی۔ جس کا لازمی نتیجہ بدھ پیروؤں کے درمیان اختلاف کا پیدا ہونا تھا ان اختلافات کو دور کرنے کے لئے مختلف راجاؤں کے زمانے میں چار کونسلیں منعقد کی گئیں۔ آخر کار چوتھی کونسل جو کہ راجہ کنشک (والئی کابل، کشمیر اور قندھار) کے زمانے میں بلائی گئی۔ متفقہ طور پر بدھ مت کی جن مذہبی کتب کو مدون کیا گیا۔ انھیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ستا دھاما SUTTA DHAMA

۲۔ ونایا VINAYA

۳۔ ابھی دھاما ABIDHAMA

پہلی کتاب گوتم بدھ اور اس کے قریبی ہمراہیوں کے اقوال پر مشتمل ہے۔

دوسری کتاب میں اخلاقی تعلیمات کو پیش کیا ہے۔ جب کہ تیسری کتاب اقوال کی تفسیر ہے جو گوتم بدھ سے منقول ہے۔

یہ کتب اس زمانے کی عوامی زبان پالی میں تھی جس کی وجہ سے عام لوگوں میں بہت مقبول ہوئی اب ان تینوں کتابوں کو ملا کر تری پٹیکا یعنی تین ٹوکریاں کہا جاتا ہے۔ تری پٹیکا کے علاوہ گوتم بدھ

کی زندگی اور تعلیمات کے بارے میں اور بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں جتکا اور دستا خاص اہمیت کی حامل ہے۔ بدھ مت کی کتاب میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان کے پڑھنے والے کو یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ بدھ مت کی اپنی تعلیمات کونسی ہیں؟ اور ان کے چیلوں کی کونسی۔ یہ کتابیں انقلاب زمانہ کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت بدلتی گئیں۔ ان کتابوں میں اکثر کا ترجمہ انگریزی میں ہو چکا ہے لہٰذا علماء یورپ اور خصوصاً جاپانی علماء اس کوشش میں ہیں کہ گوتم بدھ کی اصل تعلیمات کی نشان دہی کی جائے۔

بدھ مت کے فرقے

گوتم بدھ کی وفات کے بعد جو پہلی کونسل منعقد ہوئی اس کے نتیجے میں بدھ مت میں فرقوں کا ظہور ہوگیا گوتم بدھ کی وفات کے تقریباً ۴ سال بعد اس مذہب میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ بدھ کو خدا کا تصور دے کر اس کی پرستش کی جائے۔ حالانکہ بدھ کی تعلیم میں تو خدا کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ بدھ مت میں ایسی ایسی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اور بہت سے بیرونی روایات اور اعتقادات نے اس میں جگہ پائی۔ جس کی وجہ سے اس کی اصلیت مسخ ہو کر رہ گئی۔ اس طرح ایک عرصہ بعد بدھ مذہب دو مختلف فرقوں میں یعنی مہایان (۲) ہنیایان میں بٹ گیا۔
ان دونوں فرقوں پر حسب ذیل بحث کی جاتی ہے۔

مہایانی بدھ مت:۔ مہایان کے لفظی معنی بڑی گاڑی کے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے لوگ اس میں شمولیت کرسکتے ہیں۔ اگرچہ اس فرقہ کی ابتدائی حالت پردہ پر دے ہیں۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ اشوک کے زمانے میں اس فرقے کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ اس فرقہ کا قانون اصل بدھ مت سے قطعی مختلف تھا۔ اس کی کتابیں سنسکرت میں تھیں۔ حالانکہ بدھ کے اقوال پالی زبان میں قلم بند کئے گئے تھے۔

مہایان اور اسکے عقائد

مہایان بدھ مت میں حسب ذیل نئے اعتقادات شامل ہوگئے۔

۱۔ اس فرقے میں گوتم بدھ کو خدائی کا درجہ دیا گیا۔

۲۔ عرفان کامل کا حصول تمام لوگوں کے لئے ضروری نہیں رہا۔

۳۔ جنت اور دوزخ کا تفصیلی ذکر اس فرقے نے پیش کیا۔

۴۔ بدھ مت پر ایمان کو ذریعہ نجات سمجھا گیا۔

(۵) تصاویر اور بتوں کا عام استعمال شروع ہو گیا جس کا تصور بھی گوتم بدھ کی اصل تعلیمات میں نہیں ملتا۔

(۶) رحم کی دیوی کو بدھ مت میں وہی مقام حاصل ہو گیا جو عیسائیت میں حضرت مریم کو حاصل تھا۔

مہایان اور تصور خدا

مہایان میں بدھ کی اصلی تعلیمات کے خلاف خدا کے فقدان کی تلافی کر دی گئی اور یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ خدا کے ظہور کی تین مختلف صورتیں ہیں۔ اور ان ہی میں سے ایک صورت کے ذریعہ گوتم بدھ کا ظہور ہوا۔

مہایان اور نروان

گوتم بدھ نے صرف نروان کے حصول کو مقصد اعلیٰ قرار دیا تھا اور اس کے بعد کی زندگی کے بارے میں وہ خاموش تھا۔ جس سے کہ ایک عام آدمی کا مطمئن ہونا ناممکن تھا۔ لہٰذا مہایانیوں نے اس خامی کو دور کیا اور جنت کا ایک تصور پیش کیا گیا کہ وہاں ساکیا منی بدھ اور بدھ ستواوں کی حکومت ہے جہاں وہ لوگ اس دنیا کو چھوڑنے کے بعد سکونت اختیار کر لیتے ہیں۔ بعد ازاں یہ کافی سمجھا گیا کہ جنت میں داخلہ کے لئے نیک عمل کی بجائے بدھ ستواں پر ایمان لانا کافی ہے۔

ہنایان

ہنایان فرقہ بدھ مت کی پرانی روایات کے نظریات کا حامل تھا۔ اور اس کے معنے چھوٹی گاڑی کے ہیں۔ کیونکہ اس میں نئے عقیدوں اور نئے رسوم کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔

بدھ مت نے ابتدا سے اس مذہب کو درویشوں اور خانقاہ نشینوں کا مذہب قرار دیا تھا۔ اور اس میں داخل ہونے والوں پر گنتی کی چند پابندیاں عاید کی تھیں اور جسمانی مشقت کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس فرقہ میں صرف وہی لوگ داخل ہو سکتے تھے جو اخلاقی

احکام کی پابندی جو بدھ نے پیش کی یعنی قتل، چوری، دغا، فریب، آرائش سے پرہیز۔ سونے چاندی کے استعمال سے ممانعت نیز ہر قسم کی دنیاوی آرائش سے دور رہنا۔

اس فرقے کے لوگ عموماً مجرد زندگی بسر کرتے۔ زرد کپڑے پہنتے اور گھر سے بھیک مانگ کر گزارہ کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد مطالعہ ہے۔ بدھ مت کے ماننے والوں کی زیادہ تر تعداد چین۔ برما۔ آسام۔ نیپال۔ بھوٹان اور لنکا میں ہے۔ لیکن ہر جگہ بدھ کی ابتدائی تعلیمات میں آمیزش پائی جاتی ہے۔

کولمبو۔ رنگون اور بنکاک میں بدھ مت کی نہایت شاندار عمارتیں موجود ہیں اور اب ان میں وہ سادگی نہیں جو ابتدائی بدھ مت کی خصوصیت تھی۔ اگرچہ ان کی تعداد میں اختلاف ہے لیکن ایک اندازے کے مطابق دنیا میں ان کی آبادی پانچ کروڑ کے قریب ہے۔

بدھ مت کے عروج و زوال کے اسباب

بدھ مت ایک تبلیغی مذہب ہے۔ اس کو دنیا میں سب سے پہلے وہ درجہ حاصل ہوا جو لبعد میں عیسائیت اور اسلام کو حاصل ہوا اور اپنے وقت میں ہندوستان کے علاوہ بیرون ممالک میں بھی اس مذہب کا کافی چرچا رہا۔ ہندو مت کے عروج و زوال کے حسب ذیل اسباب ہیں۔

بدھ مت کا عروج:-

(۱) قربانیوں اور رسومات میں کمی :- قدیم ویدک دور میں قربانیوں کو مذہب میں بڑی اہمیت حاصل تھی جنہیں پورا کرنے کے لئے معاشی طور پر لوگ فنا ہو جاتے تھے۔ اور اس سے بیزار ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے جب بدھ مت کی تعلیمات کو دیکھا کہ جس میں قربانیوں سے نجات مل رہی ہے تو وہ جوق در جوق اس مذہب میں داخل ہو گئے۔

(۲) ذات پات کا خاتمہ :- ہندو مذہب میں ذات پات کا نظام رسوا کن تھا اور برہمنوں نے مذہب پر اجارہ داری قائم کر رکھی تھی اور نچلے طبقے خاص کر شودر کی حالت بد تر تھی۔ بدھ مت میں مساوات اور اخوت کا سبق دیا گیا تھا جس سے انسانیت کو ایک حد تک برابری کا یقین ہو گیا اور لوگوں نے ایسے مذہب کو قبول کرنا شروع کر دیا۔

(۳) سادہ تعلیمات :- بدھ مت کی تعلیمات نہایت سادہ تھیں اور ان میں ہندو مت کی طرح فلسفیانہ باریکیاں موجود نہیں تھیں۔ اس لئے لوگوں نے اسکی سادگی کی بنا پر اسے اپنانا شروع کر دیا۔

(۴) عوامی مذہب :- بدھ مت کے مبلغ اسکی تبلیغ مقامی زبانوں میں کیا کرتے تھے جبکہ ہندو مت کی زبان سنسکرت تھی جسے عام لوگوں کو سمجھنا دشوار تھا۔ اس لئے بدھ مت کی تعلیمات عام انسان کو بھی بھلنے لگیں اور وہ اس مذہب کے دلدادہ بن گئے۔

(۵) آسان ذریعہ نجات :- بدھ مت طرح طرح کی رسومات، منتروں اور ریاضتوں اور گھناؤنے رواجوں کی مخالفت کرتا تھا اور اس نے نجات کے لئے چند آسان اور سادہ شرائط پیش کیں۔ نجات کی راہ کو آسان دیکھ کر لوگوں میں اسے اپنانے کی تڑپ پیدا ہونے لگی۔

(۶) گوتم بدھ کی شخصیت :- بدھ مت کے عروج میں خود گوتم بدھ کی شخصیت کا بڑا اثر ہے۔

اس لئے کہ اس نے تمام دنیاوی نعمتیں ٹھکرا دیں اور حق کی تلاش کے لئے مصیبتوں کا سامنا کیا۔ اور عملی مثال پر لوگ اس مذہب کو اپنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔

(۷) **تبلیغ کی اہمیت**:۔ بدھ مت کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ تبلیغ تھا جس میں اس کے مذہبی رہنماؤں کے لئے تبلیغ کو ضروری قرار دیا گیا تھا لہٰذا تبلیغ کی وجہ سے لوگوں میں اس مذہب کا بڑا چرچا ہوا۔

(۸) **نظریہ تناسخ سے چھٹکارا**:۔ ہندو مذہب نے انسان کو نظریہ تناسخ کے حوالے کر کے اسے ہمیشہ کے لئے بے سکون کر دیا تھا اور بدھ مت نے "نروان" کا تصور پیش کر کے انسان کو نہ ختم ہونے والے دکھوں سے ایک حد تک نجات دلا دی تھی۔

(۹) **سرکاری مذہب**:۔ بدھ مت کے عروج کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ کنشک اور اشوک جیسے بادشاہوں نے اس کی سرپرستی کی اور اسے سرکاری مذہب قرار دیا۔

(۱۰) **حریف مذہب کی عدم موجودگی**:۔ بدھ مت کو اپنے ابتدائی دور میں کسی بھی ٹھوس مذہب سے مقابلہ نہیں کرنا پڑا۔ ہندو مت اپنی خامیوں کی بنا پر زوال پذیر تھا اسلام اور عیسائیت کا وجود نہیں تھا اس لئے بدھ مت کو خوب عروج ہوا۔

بدھ مت کا زوال:۔

بدھ مت نے ایک عرصہ تک انسانوں کو اپنی جانب متوجہ کئے رکھا لیکن انسانی ترقی اور نئے مذاہب کے انقلابات نے رفتہ رفتہ بدھ مت کو زوال پذیر کر دیا جس کے حسب ذیل اسباب تھے۔

(۱) **انتشار**:۔ گوتم بدھ کی وفات کے بعد اس کے ماننے والوں میں اختلاف پیدا ہو گئے اور یہ مذہب دو گروہوں میں بٹ گیا جو کہ انتشار کا سبب ہوا۔

(۲) **خدا کے بارے میں خاموشی**:۔ بدھ مت کے عقائد میں خدا کے بارے میں کوئی واضح عقیدہ موجود نہیں گوتم بدھ نے نہ تو خود خدائی کا دعویٰ کیا اور نہ خدائی کا کوئی واضح تصور پیش کیا۔

(۳) **معاشرتی زندگی سے کنارہ کشی**:۔ انسان معاشرہ میں رہنے کے لئے مجبور ہے جبکہ گوتم بدھ خود معاشرے سے کنارہ کش رہا۔ رہبانیت کی زندگی اور معاشرے سے کنارہ کشی انسان کو مطمئن نہیں کر سکتی۔

(۴) **گوتم بدھ کی ہندو مت میں تحلیل**:۔ ہندو مت نے دوسرے مذاہب کے ساتھ ساتھ

گوتم بدھ کو اپنے ہاں اوتار کا درجہ دے کر یا اندلے وشنو کا اوتار تسلیم کیا گیا اور آہستہ آہستہ
ہندومت میں مدغم کر دیا۔ لہٰذا بدھ مت اپنی انفرادیت کھو بیٹھا۔

(۵) ہندومت کا احیا :۔ گپتا خاندان نے ہندومت کے لئے بہت کام کیا یہاں تک کہ گپتا کے زمانے کو ہندومت کا سنہری زمانہ کہا جاتا ہے اس طرح لوگ پھر ہندومت کی جانب متوجہ ہونے لگے اور بدھ مت سے بیزاری برتنے لگے۔

(۶) بدھ مت کی پیچیدگیاں :۔ ابتداء میں بدھ مت نہایت سادہ مذہب تھا لیکن بعد میں ہندومت کی فلسفیانہ موشگافیاں اس میں جگہ پانے لگیں جس کی وجہ سے لوگ اس سے متنفر ہوتے گئے۔

(۷) شاہی سرپرستی کا خاتمہ :۔ بدھ مت کو اشوک اور کنشک راجاؤں کی وفات کے بعد گپتا خاندان کے ہاتھوں تباہی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ جس طرح اشوک اور کنشک نے بدھ مت کی ترویج کے لئے کوششیں کیں۔ اسی طرح گپتا خاندان نے ہندومت کو عروج سے ہمکنار کیا۔ اور ہندومت کا عروج بدھ مت کا زوال تھا۔

(۸) اصول اہنسا کی موجودگی :۔ بدھ مت میں اصول اہنسا کو بنیادی اہمیت حاصل ہے جبکہ ہندوستان کی اکثر قومیں ایسی تھیں جو ہر وقت مارنے اور مرنے پر تلی رہتی تھیں جنھوں نے بدھ مت کو کبھی قبول نہیں کیا۔

(۹) عیسائیت کا ظہور :۔ بدھ مت کے آخری زمانہ میں عیسائیوں نے باقاعدہ تبلیغ شروع کی اور غریب عوام کے لیئے دور دراز علاقوں میں جا کر علاج معالجہ کی ضروریات بہم کیں جس سے عام آدمی بھی متاثر ہوا۔ اور یوں بدھ مت سے دلچسپی جاتی رہی۔

(۱۰) اسلام کی آمد :۔ اگرچہ عیسائیت نے بدھ مت کو زوال پذیر کر دیا تھا لیکن اسلام نے اس کے تابوت میں آخری کیل کی حیثیت سے کام کیا اور چونکہ اسلام ایک مکمل نظام حیات کا حامل ہے اس لئے اس نے دیگر مذاہب کے ساتھ ساتھ بدھ مت کو بھی غار میں دھکیل دیا۔

زرتشت

زرتشت کا تعلق ایران سے ہے۔ قدیم آریاؤں نے جب وسط ایشیا کو خیرآباد کہا تو دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک نے ہندوستان کا رخ کیا اور دوسرا ایران میں آباد ہو گیا۔ جغرافیائی ماحول کی وجہ سے اہلِ ایران عملیات اور اہل ہند نظریات کی طرف مائل ہو گئے۔

زرتشت کی تعلیم اور تربیت کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے دور کے مذہبی علوم سے واقف تھا اور اسی دور کے پیشے یعنی زراعت اور گلّہ بانی کو بھی اختیار کیا۔

جوانی کے ایام میں زرتشت نے خدمتِ خلق کو اپنا مقصد قرار دیا لیکن غور و فکر نہیں چھوڑا جس چیز نے اس کو سب سے زیادہ پریشان کیا وہ یہ تھا کہ انسانی تکالیف کہاں سے آتی ہیں اور ان سے نجات کا کیا طریقہ ہے۔

اس سلسلہ میں انہوں نے پہاڑوں میں پناہ لی لیکن برسوں تک غور و فکر کے بعد بھی کامیاب نہ ہو سکے لہٰذا مایوس ہو کر تنہائی کو چھوڑ دیا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور اس نظارے نے ان پر حقیقت آشکارا کر دی۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جس طرح دن، روشنی اور تاریکی میں بٹا ہوا ہے اسی طرح دنیا بھی نیک اور بد میں تقسیم ہے۔ روشنی نیکی ہے اور اندھیرا بدی۔ اس تجربہ سے زرتشت نے یہ خیال قائم کیا کہ جس طرح نور اور ظلمت دو الگ چیزیں ہیں اسی طرح خدا بھی دو ہیں ایک نیکی اور دوسرا بدی کا۔

زرتشت کی تعلیمات

(۱) **توحید**:- زرتشت خدائے واحد کی پرستش پر اصرار کرتے تھے' ان کے نزدیک "اہورمزدہ" کی ذات سب سے بلند ہے۔ وہی مالک کائنات اور خالقِ خیر و شر ہے' گاتھا کے الفاظ میں "صداقت کا باپ کون ہے زمین اور آسمان کو کس نے سنبھالا ہے پانی اور پودے کس نے بنائے۔ ان باتوں میں اے اہورمزدہ "تیرا جلوہ دیکھتا ہوں۔

۲- **فرشتوں پر عقیدہ**:- زرتشت کا خیال تھا۔ "اہورمزدہ" دنیا کا نظام چلانے اور قائم

رکھنے میں فرشتوں سے کام لیتا ہے اور ان میں زیادہ مشہور آشا یعنی صحیح کرنیوالا اور دوسرا کھشرا یعنی قوت وطاقت والا۔

۳۔ **کائنات کا انجام**:۔ زرتشت کے نزدیک 'اہورمزدہ' عظیم خدا تو ضرور ہے لیکن اس کی مخالفت بھی موجود ہے لیکن سچ کا مقابلہ جھوٹ سے حق کا باطل سے اور موت کا زندگی ہے اور کامیابی حق کو حاصل ہے۔

اہورمزدہ نے تخلیق کے بعد ہر انسان کو خیر و شر میں تمیز کی قوت عطا کی اہورمزدہ کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ انسان خود مختار ہے۔

دعویٰ الہام:۔ زرتشت کی مذہبی کتاب "گاتھا" سے ظاہر ہے کہ انہوں نے بڑی تاکید سے اپنی الہامی صداقت کو پیش کیا۔

زرتشت اور عقیدۂ آخرت

زرتشت کی مذہبی کتاب 'اوستا' میں لکھا ہے کہ:۔ "انسان مرنے کے بعد ایسی زندگی میں داخل ہوگا جس میں نیک اعمال اور اچھے خیالات ہوں گے لیکن اس زندگی کیلئے آگ اور پل سے گزرنا ہوگا نیک لوگ اس آگ سے گذر جائیں گے اور بداعمال اس آگ میں جل جائیں گے نیک لوگوں کے لئے پل وسیع ہوجائیگا اور بدلوگوں کیلئے وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز۔ زمین اور آسمان کے درمیان ایک میزان کا تصور ہے جس پر انسانوں کے اعمال تولے جائیں گے۔

انکے یہاں دو خدا "یزداں اور اہرمن" کو مانا جاتا ہے۔ اوپر خدائے خیر کی حکومت ہے اور نیچے خدائے شر کی اور دنیا ان دونوں کے درمیان نیکی اور بدی کا اکھاڑا ہے۔

ان کے یہاں عبادت کا طریقہ سادہ ہے۔ صرف آگ جلا کر اس کے سامنے مقدس گیت گاتے ہیں اور آگ کو اہورمزدہ کی طاقت کا مظہر سمجھتے ہیں۔

اہورمزدہ کا خالق کائنات ہونا

زرتشتی عقیدہ کے مطابق ایک دن برائیوں کا خاتمہ ہو جائیگا اور صرف خدائے خیر یعنی اہورمزدہ کا دور دورہ ہوگا۔ لیکن ان کی مذہبی کتاب 'اوستا' میں اہورمزدہ فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں جبکہ یہی فرشتے اس سے پہلے ان کے دیوتا کی حیثیت رکھتے تھے اور زرتشت نے بعد میں اہورمزدہ کے علاوہ تمام دیوتاؤں کو رد کر دیا تھا اور مجسمہ سازی اور تصویر بنانے کو بھی اپنے مذہب میں ممنوع قرار

دیا۔ زرتشت نے خدائے شر کو کبھی خدائے خیر کے برابر تسلیم نہیں کیا۔

زرتشت مذہب اپنی ابتدا میں بھی دوئی کا قائل تھا اور آج بھی ہے اس سے یہ بات صحیح ہے کہ زرتشت اہورمزدہ کو خالق کائنات مانتے ہیں اس میں سچائی نہیں کہ وہ توحید کے ماننے والے ہیں یعنی زرتشت توحید کے ماننے والے نہیں۔

مذہب زرتشت کا انجام

زرتشت کی وفات کے بعد جب زرتشتی علماء نے گاتھا کی تشریح و تفسیر کی تو اس میں کئی نئی چیزیں شامل کر لیں۔ مذہبی رسوم میں جادو منتر اور ستارہ شناسی بھی شامل ہو گئے۔ دراصل مجوسیوں نے زرتشت کی وفات کے بعد زبردست تبلیغ کر کے عوام کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا اور زرتشت کے مقابلہ میں پھر ابھر آئے۔

پارسی قوم نے جب ایران کو چھوڑا تو یہ مذہب ہندومت اور اسلام سے متاثر ہوا۔ انگریزوں کے عہد میں یہ مذہب عیسائی مشنری کا شکار رہا اور بہت سے پارسی نوجوانوں نے عیسائیت کو اپنا لیا۔ جس پر پارسیوں نے اپنی کتاب گاتھا کا گجراتی میں ترجمہ کر کے زرتشت پر کئے گئے اعتراضات کا جواب دیا۔

پارسی عقائد کو ہندو رسومات سے پاک کرنے کی کوشش کی گئی اور خالص زرتشتی عقائد کی از سرِ نو ترویج کی کوشش کی گئی۔

مذہب زرتشت دورِ جدید میں

عہد حاضر میں پارسی قوم اپنے آپ کو مذہبِ زرتشت پر عمل پیرا سمجھتی ہے پارسیوں کے عقائد وہی ہیں جو اوستا کے آخر میں لکھے ہیں۔

اہورمزدہ اور انگرا مینوان کے نیکی اور بدی کے خدا ہیں۔

ثنویت کے عقیدے نے پارسیوں کو بہت متاثر کیا۔ وہ انگرا مینو کو برائیوں کا خدا ہی نہیں سمجھتے بلکہ ان کا خیال ہے کہ موت کا چکر اسی نے پیدا کیا اور آدم و حوا کو گناہ پر اسی نے آمادہ کیا۔ اسی لئے پارسی خود کو گناہ سے بچاتا ہے اور صفائی و پاکیزگی کا خیال کرتا ہے۔

طریقۂ عبادت

پارسیوں کے عقیدے کے مطابق ان کے چاروں طرف برائی ہے۔ اور اس سے بچنے کے لئے اہورمزدہ کی عبادت ہے۔ یہ آگ کی پوجا کرتے

میں یعنی آگ کے سامنے مقدس بھجن گاتے ہیں۔ اس سے خالقِ شر کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ آگ کو اہورمزدہ کی قوت کا مظہر سمجھتے ہیں اور اسے روشن کرتے ہیں اور اسی کے ذریعہ خدا کا تصور باندھتے ہیں۔ آگ جلانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان اپنے انجام کا نظارہ کر سکے کہ جس طرح آگ راکھ میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی طرح انسان بھی ایک دن فنا ہو جائیگا۔

۱۔ پارسیوں میں اعمال کے حساب
۲۔ جنت، دوزخ کا تصور

۱۔ پارسی عقیدہ کے مطابق زمین اور آسمان کے درمیان ایک ایسی جگہ ہے جہاں اچھے اور بُرے اعمال تولے جائیں گے۔ اچھے اور بُرے اعمال ایک کتاب میں لکھے جائیں گے جس میں ایک جانب اچھے اور دوسری جانب بُرے اعمال لکھے ہوتے ہیں۔ اچھے اور بُرے اعمال لکھنے کے لئے دو علیحدہ ہستیاں ہیں۔ ان کے یہ عقائد اسلامی عقیدے سے ملتے ہیں کہ "روز قیامت اعمال کا حساب ہوگا۔ اور اچھائیاں اور برائیاں لکھنے کے لئے دو فرشتے ہیں۔

جنّت کے درجات

پارسیوں کے یہاں جنت کے کئی درجے ہیں۔

۱۔ **ادنیٰ ترین جنّت** :۔ چاند ستاروں میں ہے جس میں ایسے لوگ داخل ہوں گے جو اگرچہ مذہب سے ناواقف ہوں گے نہ عبادت کی ہوگی اور نہ گاتھا کی تلاوت۔ مگر معاملاتِ زندگی میں عمدہ خیال اور عمدہ افعال رکھتے ہوں گے۔

۲۔ **دوسری جنّت** سورج میں ہے جو بادشاہوں اور حاکموں کے لئے ہے۔

۳۔ **سب سے اعلیٰ جنّت** خدائی جنت ہوگی جو نیک لوگوں کا ٹھکانہ ہوگی۔ بدکاروں کو سزا ان کے اعمال کے مطابق ملے گی۔ دوزخ میں گناہگار اتنے قریب ہوں گے جیسے آنکھ اور کان۔ یہ نہ دیکھ سکیں گے اور نہ سُن سکیں گے وہاں پر وقت طویل ہوگا۔ یعنی ایک دن نو ہزار سال کا۔ پارسیوں کے ہاں دوزخ کا کوئی مستقل وجود نہیں بلکہ برائیوں کے خاتمہ کے ساتھ دوزخ بھی ختم ہو جائے گی اور اہورمزد کی حکومت ہوگی جو خدائے خیر ہے۔

یہودیت

یہودی عبرانی نسل کے علمبردار ہیں اور مصریوں کی غلامی سے نجات کے بعد انہیں اسرائیلی کہا جاتا ہے بعض علماء ان کا قدیم وطن عراق کو قرار دیتے ہیں جبکہ بعض کی رائے یہ ہے کہ قدیم زمانے سے ہی یہ لوگ فلسطین میں آباد تھے مگر ان کی زندگی خانہ بدوشوں کی زندگی تھی۔

حضرت موسیٰؑ کی بعثت سے قبل ان کی بیشتر آبادی مصر میں آباد تھی۔ ابتدا میں یہ لوگ دریائے فرات کے آس پاس رہتے تھے چنانچہ اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ یہودیوں کا اصل وطن دریائے فرات تھا۔

حضرت موسیٰؑ سے قبل یہودیوں کا مذہب

چونکہ اسرائیلیوں کا عبرانی نسل سے تعلق ہے اس لئے یہ عبرانی تھے اور ان کے مذہبی عقائد اکثر و بیشتر عبرانی تھے البتہ انہیں تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ حجر پرستی ۲۔ خاندانی دیوتا ۳۔ قومی دیوتا۔

۱۔ حجر پرستی

عبرانی اقوام میں شروع سے حجر پرستی کا دستور تھا۔ ان کے ہاں پتھر نہایت مقدس سمجھا جاتا تھا کیونکہ انہی پتھروں سے ان کے معبود تراشے جاتے تھے چنانچہ بنو اسرائیل کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کے والد آزر بت تراش تھے بعد میں عقائد کے زیر اثر یہودیوں میں بیل یا گائے کی پوجا کا بھی رواج تھا۔ اس کے علاوہ سانپوں کی بھی پوجا کی جاتی تھی۔

۲۔ خاندانی دیوتا

یہودی عبادت کے لئے خاندانی دیوتا بھی رکھتے تھے۔ اس نظریہ کے تحت وہ اپنے خاندان کے کسی بزرگ کی یاد میں اس کی مشابہت سے بت تراشتے تھے۔

۳۔ قومی دیوتا

یہودیوں کے ہاں قومی دیوتا یہودا پکارا جاتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پہلے شخص تھے جنہوں نے یہودا کے لئے عبادت خانہ تعمیر کیا۔ حضرت اسحٰقؑ کے بارے میں بھی ایسی ہی روایات ملتی ہیں جبکہ دوسرا گروہ اس نظریہ کے خلاف

ہے۔ان کا کہنا یہ ہے کہ یہوواہ مدائن کے اس قبیلے کا دیوتا تھا۔جس کے سربراہ حضرت شعیبؑ تھے۔کیونکہ حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ کی بیٹی سے نکاح کیا تھا۔ممکن ہے کہ انہوں نے یہوواہ کو اپنانے کے بعد اسے قومی دیوتا کے نام سے یاد کرنا شروع کیا ہو۔

الغرض حجر پرستی اور خاندانی دیوتا کی پرستش کے بعد یہودیوں نے خداوند یہوواہ کی عبادت شروع کی اس کے ساتھ ہی یہ دوسرے دیوتاؤں کو بھی مانتے تھے۔یہوواہ کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ وہی انہیں قحط سے بچاتا اور دشمنوں کے حملے سے روکتا اور اپنے امن میں رکھتا تھا۔

انقلابات زمانہ کے ساتھ ساتھ یہوواہ کی حیثیت بھی بدلتی گئی اور اسے مختلف صفات کا مالک گردانا جانے لگا۔ابتدا میں اس کی حیثیت محض زمینوں کی زرخیزی تھی۔پھر اس سے اولاد مانگی جاتی اور اس کے بعد اپنے بچوں کو بھی یہوواہ کے نام پر قربان کیا جاتا۔

یہودیت دورِ حاضر میں

اگرچہ یہودیت کی صحیح تعریف مشکل ہے کیونکہ اس مذہب میں اُن کم سے کم عقائد کا تعین نہیں کیا جا سکتا جو یہودی بننے کے لئے ضروری ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مذہب کی اصل بنیاد دو قطعی اصولوں پر ہے۔

۱۔ خدا کی وحدانیت۔

۲۔ بنو اسرائیل کا خدا کی محبوب اور پسندیدہ اُمت ہونا۔

انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں یہودیت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ "یہودیت ایک ایسا فرقہ ہے جو توحیدِ خالق پر اعتقاد رکھتا ہے اور اس عقیدے کے اثر کو زندگی پر تسلیم کرتا ہے۔

یہودی مذہب دو عظیم مذاہب عیسائیت اور اسلام کا پیش رو ہے مذاہب کی تاریخ میں یہودیت کو ایک خاص اہمیت اس لئے حاصل ہے کہ یہی وہ قدیم ترین زندہ مذہب ہے جس کے ذریعہ دنیا خدا کی وحدانیت سے واقف ہوئی۔

بنو اسرائیل ایک عرصے تک اللہ کی محبوب اُمت میں شمار ہوتے رہے اور اس قوم میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ جیسے عظیم الشان پیغمبر آئے جنہوں نے انہیں عالمگیر حیثیت بخشی لیکن خدا کی نافرمانی اور پیغمبروں کی تکذیب کے جرم میں ذلیل و رسوا ہوئے انہوں نے اپنے نجات دہندہ حضرت موسیٰؑ کی نافرمانی کی اور تورات کے حکم کی نافرمانی کی اور پھر حضرت عیسیٰؑ کو جھٹلایا جس کی بناء پر یہودی قوم دنیاوی اقتدار سے محروم کر دی گئی اور عذابِ الٰہی کی مستحق ٹھہری۔ جیسے کہ قرآن کا ارشاد ہے:۔

ضربت علیھم الذلة والمسکنة وباؤ بغضب من اللہ۔

یعنی اُن پر ذلت و رسوائی ڈال دی گئی اور اللہ کا قہر ان کے حصے میں آیا۔

دورِ فرعون میں انہیں ہندو مت کے شودروں سے بھی کم تر سمجھا جاتا تھا۔ ان سے کسی معاوضے کے بغیر کام لیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی نسل کو ختم کرنے کے لئے بچوں کو ذبح کر دیا جاتا اور عورتوں کو زندہ چھوڑ دیا جاتا۔

اس حالت میں یہودی قوم اس انتظار میں تھی کہ خداوندِ کریم ان کی نجات کیلئے نجات دہندہ

کو بھیجے گا۔ لیکن جب حضرت موسیٰؑ نے ان کو فرعون کے ظلم سے نکال لیا اور ان کے سامنے فرعون کو غرق کیا۔ "واغرقنا ال فرعون وانتم تنظرون" اور صحرائے سینا میں ان کے لئے کھانے پینے کا انتظام کر دیا۔ "وظللنا علیکم الغمامۃ وانزلنا علیکم المن والسلوی" اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ اتارا۔

اور جب اسی قوم کو وادیٔ کنعان میں اللہ کی نصرت کی وجہ سے بادشاہت حاصل ہوئی تو انہوں نے پھر خدا کے احکام کی نافرمانی شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب نازل کیا۔

یہودی اپنی طویل تاریخ اور حکمرانی کے باوجود تعداد میں ہمیشہ کم رہے۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا زمانہ جو کہ ان کی شان وشوکت وعروج تھا۔ اس وقت بھی ان کی تعداد دس لاکھ سے زائد نہ تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں ان کی تعداد دو کروڑ کے قریب تھی۔ مگر نازیوں کے قتلِ عام کی وجہ سے پوری دنیا میں ان کی تعداد ایک کروڑ رہ گئی ہے۔

عیسائیت

تاریخی پس منظر

عیسائیت بالحاظ آبادی دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے اور اس کے ماننے والے تقریباً ہر جگہ موجود ہیں۔ یہودیت کی طرح عیسائیت بھی دراصل مذہب ابراہیمی کی ایک شاخ ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ عیسائیت کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے یہودیت کے متعلق جاننا بہت ضروری ہے۔

یہودیت کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کچھ عرصہ فلسطین کی حکومت نصیب ہوئی لیکن ان کی گمراہیوں نے انہیں اس قابل نہ چھوڑا کہ یہ اس مقام کو رکھ سکیں جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں نوازا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے مختلف ادوار میں پیغمبر بھیجے لیکن کسی کو انہوں نے قتل کر ڈالا کسی کو سنگسار کیا اور کسی کو آرے سے چیر اگیا۔

عیسائیت کا ظہور

عیسائیت کا ظہور اس وقت ہوا جب انقلابات زمانے کی وجہ سے یہودی منتشر ہو چکے تھے اس وقت فلسطین پر رومی حاکم "ہیروڈ" شہنشاہ روم کی طرف سے فرمانروائی کر رہا تھا۔ یہ ظلم و ستم میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر بستیاں کی بستیاں اجاڑ دیتا تھا۔ انسانی زندگی اس حد تک مفلوج ہو چکی تھی کہ مادی اسباب و حالات کی بنا پر اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ یہودی پھر کبھی آزادی حاصل کریں گے۔ البتہ انہیں اس بات کا انتظار ضرور تھا کہ ایک نجات دہندہ ہمیں ضرور اس مصیبت سے نجات دلانے کیلئے آئیگا اور ایک بار پھر ہمیں عالمگیر قوت و حکمت حاصل ہو گی۔

یہ حالات تھے کہ جب "ہیروڈ" کی حکومت کی آخری دور میں آج سے تقریباً دو ہزار سال پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام معجزانہ طور پر دنیا میں تشریف فرما ہوئے اس دور کے یہودی تو پہلے سے مسیح کی آمد کا انتظار کر رہے تھے لیکن انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ مسیح کب آئیگا۔ اس کے ساتھ ہی "ہیروڈ" مسیح کی آمد کے انتظار میں تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہی مسیح اس کی حکومت کی تباہی

کا باعث ہوگا۔

مجوسیوں کی آمد

ایک دن "ہیروڈ" کو اطلاع ملی کہ تین مجوسی ایران سے آئے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ وہ لڑکا کہاں ہے جو یہودیوں کا بادشاہ بنے گا۔ ہیروڈ نے ان تینوں کو بلا کر حال معلوم کیا۔ تو انہوں نے بتایا کہ ہم نے مشرق میں ایک ستارہ طلوع ہوتے دیکھا جس کے ساتھ چلتے چلتے ہم یہاں تک پہنچے۔ ہیروڈ نے کہا جب بھی آپ اس بچے کو تلاش کرلیں ہم کو اطلاع دیں اس کے بعد وہ مجوسی ستارے کی سمت میں چلتے رہے یہاں تک کہ یوسف نجار کے گھر تک پہنچ گئے۔ اس سلسلہ میں انجیل متیٰ کی ایک روایت پیش کرتے ہیں "جب اس کی ماں کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوگئی تو قربت سے قبل ہی روح القدس کی رحمت سے حاملہ پائی گئی اس کے شوہر نے جو نیک آدمی تھا اس بدنامی سے بچنے کے لئے چھوڑ دینا چاہا کہ خواب میں اسے خدا کا فرشتہ دکھائی دیا اور کہا کہ اے یوسف بن داؤد تو اپنی بیوی مریم کو اپنے یہاں لانے سے نہ ڈر۔ کیونکہ یہ سب کچھ روح القدس کی قدرت سے ہے۔"

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بعد ان تینوں مجوسیوں نے اسے سجدہ کیا۔ اور بادشاہ سے حال بیان نہیں کیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ انہیں قتل کردیگا۔

چنانچہ یوسف، مریم علیہا السلام اور بچے کو لے کر مصر چلا گیا۔ دوسری طرف بادشاہ نے مجوسیوں کا انتظار کیا آخر مایوس ہوکر اس نے حکم دیا کہ یروشلم کے دو برس کے تمام بچے قتل کردیے جائیں اس کے بعد جلد ہی وہ بادشاہ مرگیا۔ یوسف اپنے خاندان سمیت وطن واپس لوٹ آئے۔ قرآن نے اس کے متعلق یوں بیان فرمایا ہے ــــــ "جس وقت فرشتوں نے کہا اے مریم یقیناً اللہ تجھے بشارت دیتا ہے کلمہ کی جس کا نام مسیح ابن مریم ہے۔ مریم نے کہا میرا بچہ کیونکر ہوگا۔ اللہ نے فرمایا جو میں چاہتا ہوں کرتا ہوں۔"

حضرت عیسیٰؑ کی تبلیغ

حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل حضرت یحییٰؑ کا ظہور ہوا تھا۔ اور جب حضرت یحییٰؑ نے لوگوں کو اپنی طرف بلایا تو لوگ بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان کی طرف بڑھے کہ شاید یہی مسیح ہوں۔ لاکھوں افراد بپتسمہ حاصل کرنے ان کے پاس پہونچے جن میں غالباً حضرت عیسیٰ بھی تھے۔ جب حضرت عیسیٰ اپنے گھر سے نکلے تو انہیں یہ احساس ہوا کہ انہیں بھی یحییٰ کی طرح اپنے مشن کا آغاز کردینا چاہیئے۔ لہٰذا وہ حضرت یحییٰؑ کے پیرو

نہ تھے بلکہ انہوں نے بھی تبلیغ کرنا شروع کر دی۔ آپ اپنی ہر قوم کے فرد سے ملتے رہے جو کہ یہودیوں کو ناگوار تھا انہوں نے حضرت عیسیٰؑ پر طرح طرح کے بہتان لگانا شروع کر دیئے۔ لیکن آپ نے کسی پرواہ کے بغیر تبلیغ جاری رکھی۔

تبلیغ کا ردِ عمل

جب حضرت عیسیٰؑ نے اپنی آواز بلند کی تو لوگ آپ کے گرد جمع ہونے لگے کیونکہ آپ کی آواز پوری انسانیت کے مسائل کے حل کیلئے تھی چونکہ آپ کا قیام فلسطین تھا اس لئے آپ کا براہ راست تعلق یہودیت سے اور پھر سلطنت روما کے جابرانہ اقتدار سے تھا۔ یہ اقتدار یہودیت سے بیزار تھا اور یہودی اس سے تنگ تھے لیکن جب حضرت عیسیٰؑ کی دعوتِ انقلاب بلند ہوئی تو دونوں کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی لہٰذا اس مشترکہ خطرے کا مقابلہ کرنے کیلئے روما کی طاقت نے بھی یہودیت کی حمایت کی۔

یہودی چاہتے تھے کہ آسمانی بادشاہت صرف ان کے لئے ہو جبکہ حضرت عیسیٰؑ ہر طبقہ کے فرد سے ہمدردی رکھتے تھے آپ نے ان کی نام نہاد رسومات کی کوئی پرواہ نہ کی اور کہا کہ سبت کا دین مظلوم اور بدحال انسانوں کی خدمت کا دین ہے۔ لہٰذا جب آپ کے پیروؤں نے سبت کے دن ایک باغ سے پھل توڑ کر کھایا اور آپ نے یعنی حضرت عیسیٰؑ نے سبت کے دن ہی ایک کوڑھی کو اچھا کر دیا تو یہود کے مذہبی گروہ آپ کے خلاف ہو گئے۔

پہاڑی وعظ

جب حضرت عیسیٰؑ کے تبلیغ کی خبر ہیروڈ کے کانوں تک پہنچی تو پریشان ہوا اور آپ کے خلاف سازشوں کا جال پھیلانا شروع کیا۔ حضرت عیسیٰؑ اپنے فرض کی بجاآوری کے لئے "کیپرنوم" نامی گاؤں میں چلے گئے جو بحرِ گلیلی کے کنارے واقع تھا یہاں دو بھائیوں پطرس اور اینڈریو کو یقین ہو گیا کہ آپ ہی مسیح موعود ہیں اس موقع پر آپ نے کیپرنوم کی پہاڑی سے ایک وعظ فرمایا جس کے چند ارشادات پیش کئے جاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

"اے لوگو! یہ نہ سمجھنا کہ میں اگلے پیغمبروں کے قوانین کو توڑنے آیا ہوں۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ان پر پوری طرح عمل ہو۔ خدا کی رحمت ہو ان پر جو تحمل اور بردباری سے کام لیتے ہیں۔ جو امن اور صلح کو قائم رکھتے ہیں اور ظلم و ستم برداشت کرتے ہیں وہی خدائی حکومت کے اصل حقدار ہیں۔ تم پہلے پیغمبروں سے سن چکے ہو کہ قتل بہت بڑا گناہ ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر

تم اپنے بھائی کو گالی دو یا دھتکار دو یا اُس سے ناراض ہو جاؤ تو تم بھی خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔

تم سن چکے ہو کہ آنکھ کا بدلہ آنکھ ہے اور دانت کا بدلہ دانت لیکن میں کہتا ہوں کہ تم بدی کا مقابلہ نہ کرو اور جو تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو تم اپنا بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو۔ اپنے دشمنوں سے بھی محبت کرو۔ جو تمہیں گالیاں دے تم اسے دعائیں دو۔ جو نفرت کرے اُس سے بھی نیکی کرو۔

تاریخ عیسائیت میں عیسیٰ علیہ السلام کا یہ خطبہ (Sermon on the Mount) کے نام سے مشہور ہے اور عیسائیوں کے یہاں اس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جگہ جگہ وعظ کیے اور معجزات کا مظاہرہ کیا لیکن یہودی ذہنیت کو راہ راست پر نہ لا سکے۔ جس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہودیوں کے یہاں جس مسیح کا تصور تھا وہ یہ کہ انہیں دنیاوی طاقت حاصل ہوگی لیکن حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ میری حکومت اس دنیا کی حکومت نہیں لہٰذا یہودی ان سے مایوس ہو گئے۔ اور وہی پرانا کام یعنی حضرت عیسیٰ کو جھٹلانا شروع کر دیا

عیسائیت اور دستاویز مغفرت

عیسائیت کے عہد نامہ جدید میں پولس کے ایک خط کی عبارت سے عیسائیت کی دستاویز مغفرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تمہیں ایمان کے وسیلے سے ہی نجات ملی ہے یہ تمہاری طرف سے نہیں خدا کی بخشش ہے اور نہ ہی تمہارے اعمال کا نتیجہ۔ پھر اس کے بعد کہا گیا کہ پوپ کا کوئی بھی فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ خدا کا نائب اور مسیح کا قائم مقام ہے اور لوگوں کے گناہوں کو وہ ہی معاف کر سکتا ہے اور خدا کی رحمت اور بخشش کے دروازے لوگوں پر کھول سکتا ہے۔ ایسے عقیدے نے رفتہ رفتہ معافی ناموں کی صورت اختیار کر لی یہاں تک کہ صلیبی جنگوں کے دوران حکم جاری کیا گیا کہ جو لوگ جنگ میں خود نہ جا سکیں وہ اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیں اور ان کی نجات کیلئے یہ کافی ہے۔

سولہویں صدی میں جب پوپ سینٹ پیٹرک کے نام سے گرجا تعمیر کرنے لگا اور پیسہ کی ضرورت پڑی تو اس نے معافی نامے فروخت کرنے شروع کر دیئے اور یہ اعلان تھا کہ جو چاہے اپنے گناہوں کے مطابق معافی نامے خرید لے۔ کیونکہ خدا کی رحمت کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا اور پوپ

کے ہاتھوں میں اس کی کنجی ہے۔ جسے چاہیں مالا مال کر دیں۔ معافی نامے کا کچھ حصہ پیش خدمت ہے۔

"تم پر خداوند مسیح کی رحمت ہو، میں اس کی برکت اور اختیار سے جو اس نے مجھے دیا ہے تمہیں آزاد کرتا ہوں ہر گناہ سے خواہ وہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو۔ تم پر جہنم کے دروازے بند کرتا ہوں اور جنت کی راہیں کشادہ کرتا ہوں۔ باپ بیٹے اور روح القدس کے نام پر"

ان معافی ناموں میں مختلف گناہوں کی قیمتیں مختلف تھیں جن کی فہرست ہر ایجنٹ کے پاس موجود تھیں مثال کے طور پر ہر قتل کی قیمت سات شلنگ چھ پنس اور چوری کی ۹ شلنگ وغیرہ وغیرہ

یہ معافی نامے صرف اپنی ہی بخشش کیلئے نہیں تھے بلکہ مردوں کے لئے بھی بطور کفارہ خریدے جا سکتے تھے۔ لہٰذا ایجنٹ حضرات فروخت کیلئے اس طرح آواز لگاتے تھے۔

"آؤ بڑھو۔ جنت کے دروازے کھل رہے ہیں۔ تم ۱۲ پنس کے عوض اپنے اور اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو۔ کیا تم ایسے نااہل ہو کہ اپنے باپ کی اس ذرہ سستی نجات بھی نہیں خرید سکتے۔ اگر تمہارے پاس کچھ بھی نہیں صرف ایک کوٹ ہے تو وہی اتار دو۔ تاکہ اس بیش بہا خزانے کو خرید سکو۔

عیسائیت کی مذہبی کتب

حضرت عیسیٰؑ نے جو صحیفہ ربانی یعنی انجیل اپنے حواریوں کو دی تھی۔ تاریخ میں اس کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ کیونکہ عیسائی آپ کی واپسی کے منتظر تھے اور حواری مصیبتوں میں مبتلا تھے۔ اس لئے ایک عرصے تک انجیل کی ترتیب و تدوین نہ ہو سکی۔

شروع میں یہودیوں اور حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے عقائد میں کوئی فرق نہ تھا۔ البتہ عیسائی آنیوالے مسیح کے منتظر اور حواری کہتے تھے کہ مسیح آ چکے۔

پولس نے شروع میں جب مسیحیت کی تبلیغ کی تو انہوں نے کسی کیلئے خاص فرق نہ رکھا حضرت عیسیٰؑ کے اولین مخالف صرف یہودیا بنی اسرائیل تھے لیکن پولس کی تبلیغ سب کیلئے تھی اور ہر عقیدے کے لوگ عیسائیت میں شامل ہو گئے۔ بعد ازاں اختلافات کی بنا پر ہر ایک نے اپنے لئے ایک انجیل مرتب کرلی جن کی تعداد ۲۴ تھی۔

حضرت عیسیٰ اور ان کے حواریوں کی زبان آرامی تھی لیکن ۳۴ اناجیل میں سے سوائے ایک کے جواب نایاب ہے۔ سب کی سب یونانی زبان میں تھیں۔ نیسقیہ کی مشہور کونسل ۳۲۵ء میں منعقد ہوئی اس کے سامنے یہ مذہبی ادب رکھا گیا۔ جن میں سے چار اناجیل یعنی انجیل متیٰ، مرقس، لوقا، یوحنا اور یہودہ کے خطوط منتخب کیے گئے اور ان سب کا نام عہد نامہ جدید رکھا گیا اور باقی کو رد کر دیا گیا

۱۔ انجیل متیٰ

عیسائی عقیدے کے مطابق یہ انجیل سب سے پرانی ہے اور اس کے مؤلف کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ عہد جدید کے مصنفین کا کہنا ہے کہ ایک حصہ کا مؤلف حضرت عیسیٰ کا قریبی حواری متیٰ تھا اور وہ حصہ ضائع ہو گیا۔ اس انجیل کا نشان ۱۷۳ء سے قبل نہیں ملتا۔ اسی انجیل کی زبان کے بارے میں اختلاف ہے مگر گمان ہے کہ اسے یونانی زبان میں لکھا گیا جس کا عبرانی ترجمہ ۵۵ھ میں کیا گیا۔ بعض مورخین کے نزدیک قدیم ترین انجیل مرقس ہے۔ انجیل متیٰ میں مسیح کی معجزانہ پیدائش پر زور دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ پہلے خدا کے پاس تھے پھر انسان بن کر دنیا میں آئے تاکہ تورات کی پیشن گوئیاں پوری ہوں۔

۲۔ انجیل مرقس

یہ انجیل مختصر اور بعض روایات کے مطابق قدیم ہے جو کہ غالباً انطاکیہ میں لکھی گئی۔ یہ انجیل ان ذہنی یادداشتوں پر مبنی ہے جو جون مارک نے سینٹ پیٹرس سے حاصل کیں۔

مرقس ایک یونانی یہودی تھا۔ اس میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے لیکر جوانی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ بلکہ بپتسمہ لینے کے وقت سے شروع ہوتی ہے اور تبلیغ کی کوشش کا ذکر بھی ہے اس انجیل میں مسیح کے تجسم یا الوہیت سے پہلے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اکثر وہ باتیں جو پولس نے سجھائیں انکا ذکر کہیں نہیں ملتا۔

۳۔ انجیل لوقا

اس انجیل کا مصنف ایک غیر یہودی اور غالباً اٹلی کا رہنے والا تھا اور طبیب کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھا جس کا نام لوقا ہے۔ پولس جب روم میں قید ہوا تو اسے لوقا سے ملنے کا شوق ہوا تھا۔ لوقا کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے اس انجیل کے علاوہ رسولوں کے اعمال کو بھی لکھا ہے اس انجیل کو پہلی صدی کے آخر میں مدون کیا گیا۔

۲۔ انجیل یوحنا

اس انجیل کو حضرت عیسیٰ کے حواری یوحنا کی طرف منسوب کیا گیا ہے لیکن جدید تحقیق کے مطابق اس کا مؤلف کوئی اور یوحنا تھا جس نے پہلی صدی کے آخر میں اس انجیل کو مرتب کیا۔

اس انجیل میں فلسفہ یونان کی پوری چاشنی ہے۔ یہ دیگر تین اناجیل سے زبان اور بیان میں بالکل مختلف ہے۔ اس انجیل میں مدلل اور طویل تقاریر ملتی ہیں جن کے ذریعہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو پوری طرح ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اناجیل کے قدیم نسخے

اناجیل کے جو نسخے پہلی صدی کے آخیر میں مکمل ہوئے وہ جوں کے توں موجود نہیں۔ ان میں ہر طرح کا رد و بدل ہوتا رہا۔ دنیا میں صرف تین اناجیل کے نسخے موجود ہیں۔

۱۔ ویٹیکن۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق غالباً ۳۵۰ء صدی سے ہے جس میں عہد نامہ قدیم و جدید کی کتابیں یونانی زبان میں موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس دور میں بائبل میں اتنی ہی کتابیں ہوں اور باقی کا اضافہ بعد میں ہوا ہو۔

۲۔ دوسرا نسخہ اسکندریہ کا ہے جو اب بھی برٹش میوزیم میں ہے اس کی ترتیب و تدوین بھی ۴۵۰ء میں ہوئی اس کی زبان یونانی ہے لیکن تدوین ناقص اور نامکمل ہے۔

۳۔ تیسرا نسخہ سنیا کہلاتا ہے جو اب بھی روس کے سابق دارالحکومت پیٹرگراڈ میں موجود ہے اور بعد میں انگریزوں کو فروخت کر دیا گیا۔

اس کے آخری باب میں حضرت عیسیٰ کے آسمان پر تشریف لے جانے کا ذکر ہے جس کا اضافہ غالباً بعد میں کیا گیا۔

اناجیل کے تراجم

چوتھی صدی عیسوی میں ان اناجیل کا ترجمہ یونانی زبان سے لاطینی زبان میں کیا گیا جو کہ اس انگریزی ترجمہ کا ماخوذ ہے جو ۱۶۱۱ء میں شائع کیا گیا اور جسے مستند ترجمہ کا نام دیا گیا۔ لیکن بعد میں اسے بھی ناقص قرار دیا گیا۔ ۱۸۷۰ء میں ۲۷ عیسائی علماء کی ایک میٹنگ ہوئی جن کی کوشش سے ایک اور ترجمہ سامنے آیا۔ بائبل سوسائٹی وقتاً فوقتاً اناجیل کے جو ترجمے شائع کرتی وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے اور اسی طرح اختلافات بڑھتے گئے۔

ٹرمنیٹ میٹنگ

ان اختلافات کو ختم کرنے کیلئے ۱۵۶۲ء میں ٹرمنیٹ کے مقام پر ایک کونسل منعقد ہوئی جس میں اناجیل کے اختلافات سے بحث کی گئی۔ اور ایک روداد شائع ہوئی جس میں کہا گیا کہ ویٹیکن ایڈیشن میں موجود جو بھی کتابیں ہیں انہیں آسمانی تصور کیا جائے اس طرح وہ تمام روایات جو اس سے قبل رد کر دی گئی تھیں آسمانی قرار پائیں اور انہیں وحی کا ہم پلہ قرار دیا گیا۔

اب یہ طے کیا گیا کہ اناجیل کا ایک نسخہ شائع کر کے اسے مستند تسلیم کیا جائے اور اس کام کیلئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس نے بڑی محنت سے ایک نسخہ مرتب کیا لیکن پوپ کو وہ پسند نہ آیا۔ لہٰذا پوپ نے علماء کی ایک مجلس قائم کی اور اس طرح ۱۵۹۰ء میں ایک نسخہ شائع ہوا اور ۱۵۹۲ء اور ۱۵۹۳ء میں اس نسخہ کے توضیح شدہ ایڈیشن شائع ہوئے لیکن اختلافات پھر بھی رفع نہ ہو سکے۔

الغرض عہد نامۂ جدید کا جدید ترین نسخہ غالباً ۱۹۶۱ء میں شائع کیا گیا۔ جو کہ جدید انگریزی میں ہے۔

عیسائیوں کے فرقے

عیسائیت آغاز ہی سے تفرقہ کا شکار ہو گئی جس کی وجہ یہ تھی کہ علماء اعمال صالحہ کے عقیدے پر زور دیتے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عقائد کی بنیاد پر اختلاف رونما ہوئے۔

مسیحیت اس دین کا نام ہے جو مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس کی مذہبی کتاب بائیبل ہے جس میں عہد نامہ جدید و قدیم دونوں شامل ہیں۔

موجودہ دور میں عیسائیت کے دو بڑے فرقے قابل ذکر ہیں۔

۱۔ رومن کیتھولک اور ۲۔ پروٹسٹینٹ

۱۔ رومن کیتھولک

رومن کیتھولک ہی ایسا فرقہ ہے جسے ہم حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات پر صحیح چلتے ہیں۔ جب حضرت عیسیٰؑ اپنی تبلیغ کے سلسلے میں گیلیلی کے مقام پر آئے تو انہوں نے عیسائی عقیدہ کی جو تعریف کی۔ اس میں آسمانی بادشاہت زیادہ تھی۔

حضرت عیسیٰ نے اس مذہب میں شریک ہونیوالوں پر صرف دو شرائط لگائیں۔ توبہ

اور ایمان۔ حضرت عیسیٰ نے تبلیغ کے ابتدائی چھ ماہ میں توبہ پر زور دیا۔ کیونکہ یہی تبدیلی قلب اور تغیر اخلاق کا مظہر ہے۔ آپ کہا کرتے تھے کہ مبارک بھی وہی لوگ ہیں جو غریب ہیں۔ مسکین ہیں۔ صاف دل ہیں اور جو انصاف کیلئے مصیبت اٹھاتے ہیں کیونکہ آسمانی بادشاہت انہی کی ہے۔

بعد میں حضرت عیسیٰ نے اس عقیدے کی تبلیغ کی جسے ہم آجکل عیسائیت کا معمہ کہتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ آسمانی بادشاہت حاصل کرنے کیلئے صداقت اور ایمان کا عقیدہ ضروری ہے۔ خدا کی مرضی اور مہربانی کے راستوں سے اس کی پیروی کریں۔ یہ آپ کی تبلیغ کا ایک رخ ہے جس پر رومن کیتھولک کا پختہ عقیدہ ہے۔

انجیل لوقا میں حضرت عیسیٰ کا یہ قول بیان کیا گیا ہے۔

"ابراہیم کے وجود سے پہلے میں تھا۔ میں مقدس باپ سے ہوں اور مقدس باپ مجھ سے۔ مقدس باپ جن چیزوں کا مالک ہے وہ میری ہیں۔ میں مقدس باپ سے پیدا ہوا ہوں۔"

ایک اور باب میں آپ کا یہ قول ہے کہ:۔

"ابھی مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ لیکن ابھی تم انہیں برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ جو صداقت کی روح ہے تم کو صداقت کی پوری تعلیم آکر دے گا اور جو آنیوالی ہیں ان کی بھی تعلیم دے گا۔"

ایسی ہی حیرت میں ڈالنے والی باتوں پر یقین رکھنے والے فرقہ کا نام رومن کیتھولک ہے۔

کیتھولک کے بنیادی عقائد

۱۔ ہم آسمانی روشنی سے ربط رکھتے ہیں اور وہ ایسی روشنی ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو گوشت اور خون کے قدرتی تقاضوں کی قوت سے بالاتر سمجھتے ہیں۔

۲۔ ہم ان تمام اشخاص سے روحانی رشتہ محسوس کرتے ہیں جو اعلانیہ اس راہ صداقت پر چلتے ہیں اور جو ان کو اس ذات سے حاصل ہے جو حضرت عیسیٰ سے مشابہ ہے۔

الغرض رومن کیتھولک عیسائی فرقوں میں ابتدائی فرقہ ہے اور ان کے یہاں پوپ کی ذات

حضرت عیسیٰ کی نمائندگی کرتی ہے۔

پروٹیسٹنٹ

پروٹسٹنٹ فرقہ دراصل رومن کیتھولک کلیسا کے خلاف احتجاج کے طور پر وجود میں آیا۔

پروٹسٹنٹ تحریک ۱۵۲۹ء میں جرمنی سے شروع ہوئی جس کا بانی مارٹن لوتھر تھا جس نے مسیحی دنیا کی ریشہ دوانیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ یہ شخص نہایت نیک دل خدا پرست اور جوشیلا مبلغ تھا۔ اس نے ابتدا میں نیک نیتی سے عیسائی کلیساؤں کو صحیح تبلیغ کی طرف مائل کرنا چاہا۔ اس تحریک کا زیادہ تر انحصار بائیبل پر ہے جسے اس تحریک کے ماننے والے دین کی بنیاد قرار دیتے ہیں پروٹسٹنٹ تحریک نے دو بڑے کارنامے انجام دیئے یعنی انجیل کی اشاعت کا منظم انتظام اور مسیحیوں میں آزاد خیالی اور معقول پسندی کے رجحانات. لیکن رومن کیتھولک اس آزاد خیالی کو مسیحیت کا دشمن قرار دیتے ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق عیسائیوں کی کل تعداد ۷۰ کروڑ کے قریب ہے اس میں پروٹسٹنٹ ۲۰ کروڑ افراد پر مشتمل ہیں۔

حضرت عیسیٰ کے حواری

حضرت عیسیٰ کے بعد جن لوگوں نے عیسائی تبلیغ کی ذمہ داری اٹھائی وہ حوارین کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حضرت عیسیٰ سے براہ راست مذہبی تعلیم حاصل کی۔

جب حضرت عیسیٰ کو گرفتار کیا گیا تو یہ گلیلی کی طرف بھاگ گئے۔ لیکن بعد میں انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کے ساتھ وفاداری نہیں کی تو اپنے کئے پر شرمندہ ہوئے اور اس کا کفارہ اس طرح ادا کیا کہ عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلے میں ان لوگوں نے بڑی تکالیف برداشت کیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں اچھی خاصی تعداد ان کی عقیدت مند ہو گئی۔ حوارین کی تبلیغ سے قبل عیسائیت کا کوئی علیحدہ وجود نہ تھا بلکہ وہ یہودیت کی ایک شاخ تصور ہوتی تھی۔ اناجیل کی رو سے عیسیٰ کے ان حواریوں کی تعداد [redacted] تھی اور یہی رسول کہلاتے تھے ان میں دو حوارین یعنی پطرس اور سینٹ پال زیادہ اہم ہیں۔

پطرس

حضرت عیسیٰ کے ابتدائی پیرو معمولی حیثیت رکھتے تھے اور زیادہ تر ماہی گیر تھے۔ پطرس ابتدا میں فلسطینی یہودی تھا۔ اور ماہی گیروں کے اس گروہ سے

تھا جو سب سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے اس کا اصل نام سالمن تھا اور غالباً حضرت عیسیٰ نے اس کا نام پیٹر یا پطرس رکھا تھا۔

عیسائی عقیدہ کے مطابق مصلوب ہونے کے بعد حضرت عیسیٰ نے پطرس پر ظہور فرمایا اور بنی اسرائیل کی بھیڑوں کو اس کی نگرانی میں دے دیا۔ پطرس کی مذہبی سرگرمیوں کا یروشلم کے یہودیوں کو اس وقت علم ہوا جب پطرس نے جرمنی کے ایک مریض کو حیرت انگیز طریقے سے ٹھیک کر دیا۔ پطرس سے سوال کیا گیا تم نے کس کے نام سے مریض کو اچھا کیا جواب میں اس نے کہا عیسیٰ المسیح کے نام سے۔ چنانچہ معبد کے پجاریوں نے اس کو معبد کی حدود میں تبلیغ کرنے سے منع کر دیا

بعض روایات میں پطرس کو روسی چرچ کا پادری بنا دیا گیا اور پاپائیت کا آغاز اسی کی ذات سے منسوب کیا گیا ہے۔

نیز اس کے نام سے دو خطوط بھی منسوب ہیں جو عہد نامہ جدید میں موجود ہیں۔

سینٹ پال (پولوس)

عیسائیت کی تاریخ میں سینٹ پال کی شخصیت پطرس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ یہ بھی یہودی تھا اور حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے وقت یروشلم میں ہی موجود تھا۔ یہ شروع میں عیسائیت کا شدید دشمن تھا اور حضرت عیسیٰ کے پیروؤں کو اس نے بہت تکلیف پہنچائی۔

یونانی یہودیوں نے جب عیسائی مذہب قبول کیا تو بڑے زور و شور کے ساتھ اس کی تبلیغ کی جن میں سینٹ اسٹیفن سب سے زیادہ تھا۔ اس نے یہودی معبدوں پر کھلے طور پر تبلیغ شروع کی جس کی وجہ سے اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ جس میں سینٹ پال پیش پیش تھا۔ اور اسی نے اسٹیفن کو قتل بھی کرا دیا۔

لیکن جب اس نے عیسائیت کو ختم کرنے کے لئے دمشق کا سفر کیا تو عیسائی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ نے اس پر ظہور فرمایا اور فوراً اس کی فطرت میں انقلاب پیدا ہو گیا اور جس قدر عیسائیت کا وہ پہلے دشمن تھا اسی قدر اس کا مبلغ بن گیا چنانچہ وہ کہتا ہے کہ میں نے مذہبی تعلیم حضرت عیسیٰ سے حاصل کی ہے۔

سینٹ پال نے عیسائیت کے فروغ کیلئے متعدد ملکوں کے سفر کئے اور عبادت گاہیں تعمیر کرائیں اور آج عیسائیت جس مقام پر ہے بعض عیسائی مورخ اس کا سہرا سینٹ پال کے سر باندھتے ہیں۔

بپتسمہ

عیسائی مذہب کی رُو سے بپتسمہ ایک مذہبی امر ہے جس سے روح کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور خدا کی اولاد کا درجہ نصیب ہوتا ہے۔
پادری کی ذمہ داری ہے کہ وہ عیسائیت قبول کرنیوالے فرد اور وہ بچے جو عیسائی گھرانے میں پیدا ہوں جتنا جلد ممکن ہو اس رسم کو پورا کرے اور اگر پادری موجود نہ ہو اور یہ خطرہ ہو کر بچہ مرجائیگا تو کوئی بھی عیسائی مرد اس رسم کو پورا کر سکتا ہے۔
بپتسمہ عام پانی سے دیا جاتا ہے اور یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں کہ میں بپتسمہ دے رہا ہوں باپ بیٹے اور روح القدس کے نام پر۔
یہ رسم مذہب یہود میں بھی موجود تھی۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت زکریا نے دریائے فرات پر اپنے پیروؤں کو بپتسمہ دیا۔

کلیسائے انگلستان

عیسائیت ۹۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک کلیسائے روم کے زیر اثر تھی اور یہی وہ دور ہے جب پوپ اور انگلستان کے شہنشاہ کے درمیان اقتدار کی کشمکش کا آغاز ہوا۔ اس وقت ہنری ہشتم انگلستان کا بادشاہ تھا جو یہ چاہتا تھا کہ اپنی بیوی کیتھرائن کو طلاق دے مگر پوپ اس پر راضی نہ تھا اور پوپ کی اجازت کے بغیر یہ ناممکن تھا۔ لہٰذا ہنری نے انگریزی کلیسا کو روم سے الگ کر دیا اور "کلیسائے انگلستان" کے نام سے ایک آزاد کلیسا کی بنیاد رکھی جس کا سربراہ انگلستان کا بادشاہ خود تھا۔
انگریزی اور رومی کلیسا میں صرف اتنا فرق تھا کہ انگریزی کلیساہیں دعائیں انگریزی میں پڑھی جاتی تھیں اور تمام رسومات وہ تھیں جن کو پاپائے روم کی سند حاصل تھی۔ الزبتھ اول کے زمانے میں کلیسائے انگلستان نے درمیانی راہ اختیار کی جو کہ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عقائد سے ہٹ کر تھی۔
۱۶۰۰ء میں پیورٹین تحریک وجود میں آئی جن کا نظریہ یہ تھا کہ انگلستانی کلیسا رومن کیتھولک عقائد کو ترک کر دیں۔ یہ دو بار بپتسمہ لینے پر یقین رکھتے تھے۔ ایک اور فرقہ کویکر وجود میں آیا جو نہ پادریوں پر یقین رکھتا تھا اور نہ کلیسا کی حیثیت کو تسلیم کرتا تھا۔ اس کے نزدیک مذہبی رسومات کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

مارٹن لوتھر

مارٹن لوتھر جرمنی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا اور ایک غریب والدین کا بیٹا تھا۔ اس کے والدین نے اس کی تعلیم پر پوری توجہ دی اور یہ پادری کے درجہ تک پہنچ گیا۔ پاپائیت کے خلاف اس کے دماغ نے جنم لیا اور چند ہی سال میں اس نے "آخری نجات کے اصولوں کیخلاف جو پوپ نے گھڑ رکھے تھے اپنے نئے اصول تیار کر لئے۔ ابھی یہ اپنے اصولوں کو عوام میں پیش بھی نہ کر پایا تھا کہ پوپ نے "دستاویز مغفرت" جاری کر دی۔ جو پادریوں کے ذریعہ ہر شہر اور گاؤں میں فروخت کی جانے لگی۔

مارٹن لوتھر جس شہر میں رہتا تھا وہاں بھی ایک پادری کے پاس ان دستاویز کی ایجنسی تھی۔ لوتھر نے اس پادری سے کہا کہ یہ فعل عیسائیت کے خلاف ہے اور وہ اس سے مناظرہ کرنے کو تیار ہے اور لوتھر نے ۹۵ نظریات تیار کئے اور لکھوا کر ۲۱ اکتوبر ۱۵۱۷ء کو مقامی گرجا گھر کے دروازے پر لٹکا دیا گویا لوتھر کا یہ فعل پاپائیت کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔

جب جرمنی کے عوام کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے بڑھ چڑھ کر اس تحریک میں حصہ لیا اور لوتھر کی حمایت میں آوازا ٹھنے لگی۔ شروع میں پوپ نے اس طرف توجہ نہ دی مگر جب حالات نازک ہو گئے تو ۱۵۲۰ء میں پوپ نے ایک فرمان جاری کیا اور اس کے ذریعہ مارٹن لوتھر کے نظریوں پر لعنت اور نفرت کی اور اس کے ماننے والوں کو مردود قرار دیا لیکن جب یہ فرمان لوتھر کو ملا تو اس نے سب کے سامنے اس کو نذر آتش کر دیا اس کے بعد پوپ نے پادریوں کی ایک کانفرنس طلب کی جس میں مارٹن لوتھر بھی موجود تھا اور لوتھر نے سب کے سامنے اپنے نظریات کے صحیح ہونے کا اعلان کیا۔

اگرچہ اس قسم کے لوگوں کیلئے پاپائیت کی عدالت موجود تھی اور لوتھر کی موت نظر آ رہی تھی لیکن عوامی جذبات کے تحت لوتھر کو صرف پناہ لینی پڑی اور پاپائیت کا جوشِ انتقام اس تک نہ پہنچ سکا۔

لوتھر کی اصلاحِ مذہب کی تحریک دن بدن طاقتور ہوتی گئی اور آخر کار اس نے ایک مستقل فرقہ کی حیثیت اختیار کر لی جو پروٹسٹنٹ کہلاتا ہے۔

مختصر نوٹس

اوستا
زرتشت کی مذہبی کتاب

اوستا زرتشت مذہب کی مذہبی کتاب ہے جسے یہ لوگ الہامی کتاب کہتے ہیں۔ اوستا میں جو سب سے پرانا حصہ ہے وہ زرتشت کی اپنی تصنیف ہے اور اس کی زبان رگ وید سے ملتی ہے۔

یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل تھی لیکن جب سکندر اعظم نے تخت جمشید پر حملہ کیا تو اوستا کے فلسفہ اور نجوم سے تعلق رکھنے والے موضوعات محفوظ کر کے باقی تمام جلدوں کو جلا دیا اور اس طرح صرف ۱۲ جلدیں محفوظ رہیں۔

اوستا کا ایک اہم حصہ ہے "گاتھا" اور اس کے متعلق خیال ہے کہ زرتشت نے خود اسے لکھا ہے جو نظم میں ہے تنسر جو ساسانی خاندان کا وزیر تھا۔ اس نے اس کی تدوین شروع کی اور جو حصہ اس کتاب کا ملا اسے جمع کیا۔

لسانی اعتبار سے یہ کتاب بہت اہم ہے کیونکہ یہ کتاب اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب آریائی نقل وطن کیا تھا۔ ہندی زبان اور دنیا کی دوسری پرانی زبانوں کو جاننے کے لئے اوستا کا مطالعہ ضروری ہے اور کافی مدد ملتی ہے بعد میں اوستا کی تفسیر پہلوی (ایرانی) زبان میں لکھی گئی جسے "ژند" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اوستا میں جو گناہ زیادہ اہم تھے، وہ یہ ہیں۔

۱۔ کسی شخص پر ناجائز حملہ کرنا اور پھر اس کا تاوان (نقصان) نہ دینا۔
۲۔ کسی ایسے گھر میں آگ لے جانا جہاں موت ہوئی ہو۔
۳۔ نعش کو پرندوں کے حوالے کرنے سے پہلے اسے اچھی طرح نہ باندھنا۔
۴۔ کسی گڈریے کے کتے کو اچھی غذا دینا۔

زرتشت کی اصل تعلیم میں ان کا وجود نہیں، یہ منسوب کر دیئے گئے ہیں آخری "اوستا" ساسانی بادشاہ شاپور دوم کی نگرانی میں مرتب ہوئی۔

تری پٹیکا
بادھ مذہب کی کتاب

گوتم بدھ کی زندگی میں بدھ مت کی تعلیم کے بارے میں کوئی کتاب نہ تھی۔ کیونکہ اس کی تعلیم اخلاق تک محدود تھی۔ بدھ کے انتقال کے بعد اس کی تعلیم کو تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی۔

۱۔ پہلی مجلس مگدھ کے نزدیک بلائی گئی جہاں بدھ چیلوں نے بدھ کے احکامات کو کتابی صورت دی۔

۲۔ دوسری مجلس گوتم بدھ کے ۱۰۰ سال بعد بلائی گئی۔ اس میں ۱۰ نئے نکات طے کئے گئے اور بدھ مت کے دس پرانے اصولوں کو غلط قرار دیا گیا۔

۳۔ تیسری مجلس پاٹلی پتر کے مقام پر راجہ اشوک کی سرپرستی میں منعقد ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مذہب دور دور تک پھیل گیا تھا اور اس میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے انکو دور کرنا تھا۔

۴۔ چوتھی مجلس راجہ کنشک کے زمانہ میں منعقد ہوئی جس کا مقصد تعلیم کی ترتیب و تکمیل تھا۔ ان مجلسوں کے ذریعے بدھ مت کی جن مقدس کتابوں کو ترتیب دیا گیا انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

۱۔ ستایا دھاما ۲۔ ونایا ۳۔ ابھی دھاما۔

۱۔ پہلی کتاب گوتم بدھ اور ان کے چیلوں پر مشتمل ہے

۲۔ دوسری میں اخلاقی ضوابط کا ذکر ہے

۳۔ تیسری میں بدھ کے اقوال کی تشریح ہے جو پہلی کتاب میں درج ہے۔

ان تینوں کتابوں کی زبان پالی تھی جو اس زمانے کی عام کتاب تھی۔ ان تینوں کتابوں کو ملا کر اس کا نام "تری پٹیکا" رکھا گیا جس کے معنی تین ٹوکریوں کے ہیں۔

تری پٹیکا میں سب سے زیادہ اہمیت پہلی کتاب "ستایا دھاما" کو حاصل تھی۔ کیونکہ اس میں بدھ مت کی تعلیمات کے معاملے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

تری پٹیکا کے علاوہ گوتم بدھ کی زندگی اور تعلیمات کے بارے میں اور بھی کتابیں لکھی گئیں۔

بدھ مت کی کتابوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان کے مطالعہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان میں بدھ مت کی اپنی تعلیمات کون سی ہیں اور اس کے چیلوں کی کونسی؟

تالمود۔ یہودی مذہب کی کتاب

جب رومی شہنشاہ ٹائٹس نے یروشلم کے یہودی معبد کو برباد کر دیا۔ تو اس کے ساتھ

یہودی مذہبی کتاب کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ عقبہ بن یوسف نے زبانی روایات کو جمع کر کے دو کتابوں کی صورت میں مدون کیا۔

مشنا۔ جو تمام قانونی روایات پر مشتمل ہے۔

مدارش۔ جو تورات کے قانونی حصہ کی تفسیر ہے۔

مشنا عبرانی زبان میں لکھی گئی۔ اس لئے جب یہ کتاب بابل کے یہودیوں کو ملی تو انہوں نے اس کی مزید تفسیر لکھی جسے گمارا کہا جاتا ہے۔

گمارا اور مشنا دونوں کو ملا کر "تالمود" کا نام دیا گیا۔ تالمود ان مباحثہ کا خلاصہ ہے جو مذہبی اور قانونی مسائل کے بارے میں علمائے یہود میں جاری رہے۔

تالمود میں افسانے، اخلاقی قوانین۔ عبادات اور دیگر ضروری امور شامل ہیں۔

تالمود کی ترتیب کا کام دو مختلف درس گاہوں کے ذمہ تھا۔ ان دونوں کا طریقہ جدا تھا۔ اس لئے تالمود کے دو مجموعے تیار ہوگئے۔ ایک تالمود فلسطین کی اور دوسری بابل کی دونوں کو یہود کے ہاں برابر کا درجہ دیا گیا، لیکن اختلاف رائے کی صورت میں بابل کی تالمود کو ترجیح حاصل ہے۔

ہر یہودی پر مذہباً فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو یہودی قانون و شریعت سے باخبر رکھے یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کی مذہبی کتابوں میں تالمود کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

موجودہ زمانہ میں یہود کا کوئی مذہبی مرکز نہیں۔ اس لئے مذہبی امور کا فیصلہ تالمود کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ تالمود کا عالم ربانی کہلاتا ہے۔ ربانیوں کی کوئی تنظیم موجود نہیں البتہ بعض ربانیوں کو اپنے علم کی فوقیت کی بنا پر خاص مقام حاصل ہے

اپنشد
ہندو مذہب کی کتاب

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں اپنشد کا ایک اہم مقام ہے جس کا تعلق آٹھویں صدی ق۔م سے ہے۔

اپنشد کا فلسفہ:۔ اپنشد کا فلسفہ حقیقت میں تارک الدنیا لوگوں کے لئے وجود میں آیا اور اس میں پہلی بار انسان کو فکر سے کمزور کرنے کے بجائے دماغی طاقت پر قابو پانے کی تعلیم دی۔

اپنشد اور ذات پات:۔ اپنشد میں ذات پات کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے جس کی وجہ سے نیچی ذات کے لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم برہمنوں سے افضل ہیں اور اس طرح برہمن

کے تصور میں انقلاب برپا ہو گیا۔

اپنشد میں برہما کو خدائے اعلیٰ بتایا گیا ہے وہ تمام کائنات کا خالق ہے اور لوگوں کے دلوں اور کائنات کی ہر چیز میں موجود ہے اس کی ذات رنج و فکر سے آزاد ہے۔ اور موت کا کوئی غم نہیں۔

نروان کا حصول

اپنشد میں انسان اپنی دماغی طاقتوں پر قابو پا کر دنیا کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس قابل بن جاتا ہے کہ نجات حاصل کرے اور نروان کا حصول اس کیلئے آسان ہو جاتا ہے۔ اپنشد میں ان اخلاقی تعلیمات کا ذکر ملتا ہے جو انسان کو یوگ (جسمانی ورزش) کی طرف لے جاتی ہے اور جن سے انسان سفلی خواہشات پر قابو پا لیتا ہے اور اعلیٰ مقصد حاصل کر لیتا ہے اور مختلف جسمانی ورزش اور ظاہری آداب کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔

فلسفۂ یوگ کے ذریعہ نجات حاصل کرنے کے بعد انسان آواگون کے چکر سے نکل جاتا ہے۔

تناسخ یا آواگون
(ہندو مذہب میں)

برہمنا کے عہد میں سب سے زیادہ اہم عقیدہ جو ہندو مت کا جزو بن گیا۔ وہ تناسخ یا آواگون کا عقیدہ ہے۔ ویدوں میں یہ عقیدہ کہیں نہیں ملتا۔ اس کے برعکس ان کتابوں میں بقائے شخصی عقیدہ ملتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح آزاد رہتی ہے اور اسے دوبارہ دنیا میں نہیں آنا پڑتا۔ لیکن "ست پت برہمنا" میں پہلی بار اس بات کا انکشاف کیا گیا کہ جو لوگ مذہبی رسم کو اچھی طرح ادا نہیں کرتے انہیں مرنے کے بعد پھر اس دنیا میں آنا پڑتا ہے۔ بدھ مت اور جین مت میں قربانی سے نفرت کا جو جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ تناسخ کے عقیدے کی وجہ سے ہی ہے۔ اس عقیدے کی رو سے ہر انسان کے باپ دادا اور رشتے دار جانوروں کی صورت میں دوبارہ جنم لیتے ہیں۔ لیکن یہ خیال اس لئے کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا کہ اس عقیدے کے بعد بھی قربانی کا سلسلہ عرصۂ دراز تک جاری رہا۔

عقیدۂ تثلیث

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی تعلیمات کے ذریعہ ایک خدا کی عبادت کرنے کو کہا اور یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ وہ خدا ہیں یا خدا کے بیٹے ہیں، یا خدائی میں شریک ہیں۔ عیسائیت جب فلسطین سے باہر نکلی تو غیر یہود پر بھی اس کے دروازے کھل گئے اور جنرائے واحد کا تصور تین خداؤں میں بدل گیا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عقیدۂ توحید پر رومی اور یونانی اثرات غالب آگئے۔ اور توحید کی جگہ "عقیدۂ تثلیث نے جنم لیا۔ جس میں تین لازمی جزو "باپ، بیٹا اور روح القدس" قرار پائے یہ تینوں برابر کی حیثیت کے ہیں اور کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں۔ عقیدۂ تثلیث عیسائی ادب میں ملتا ہے جو کہ قابلِ قبول نہیں کیونکہ نہ تو حضرت عیسیٰؑ نے پیش کیا اور نہ اسلام نے اس عقیدہ کو پیش کیا۔

عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں لیکن اس کا جواب قرآن کریم یوں دیتا ہے کہ "اللہ نہ تو کسی کا بیٹا ہے اور نہ اس کا کوئی بیٹا۔"

مادرِ خداوند۔ باپ، بیٹے اور روح القدس کو جب عقیدۂ تثلیث کے ذریعہ تسلیم کر لیا گیا تو حضرت مریمؑ کو کیوں نظر انداز کیا گیا۔ ۴۳۱ء میں اسکندریہ کے فرماں روا سارل نے حضرت مریم کو بھی تثلث کا ایک لازمی جزو قرار دیا جس سے حضرت مریم کی مورتی کی پوجا شروع ہو گئی اور ان کی شان میں بہت سی اناجیل لکھی گئیں۔

کفارہ عیسائیت جب تک فلسطین تک محدود رہی لوگوں میں مسیح ابن اللہ ہونے کا تصور نہ تھا۔ جب عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی تو ان میں آسمانی باپ کے تصور میں انقلاب آنا شروع ہو گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت اور چند عناصر نے یہ خیال پختہ کر دیا کہ مسیح خدا کے بیٹے تھے اور خدا نے انہیں اپنی انسانیت کی نجات کے لیے اس دنیا میں بھیجا تھا۔ کفارہ کا یہی عقیدہ قرونِ وسطیٰ میں دستاویزِ مغفرت کی شکل میں آیا اور بہت سے گرجا گھر نے خصوصاً جرمنی میں پول کی طرف سے نجات کیلئے دستاویزات فروخت کی گئیں اور بڑے بڑے شہروں میں ایجنٹ، دو زنگا کران کو فروخت کرتے ــــ "آؤ بڑھو، جنت کے دروازے کھل رہے ہیں تم ۱۲ بنس دے کر اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو۔"

یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں تصوّرِ خُدا

یہودیت اور تصورِ خدا

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں یہودیت کی تعریف یوں ہے کہ یہودیت ایک ایسا فرقہ ہے جو توحید خالق پر ایمان رکھتا ہے اور عملی زندگی پر اس کے اثر کو تسلیم کرتا ہے۔ یہودیت دو عظیم مذاہب عیسائیت اور اسلام کا پیش رو ہے (یعنی ان دونوں مذاہب سے پہلے کا ہے) اور یہودیت کو خصوصیت اس لیے ہے کہ اس قدیم ترین مذہب کے ذریعے دنیا خدا کی وحدانیت سے آشنا ہوئی۔ یہ قوم ایک بڑے عرصے تک خدا کی برگزیدہ اور محبوب امت شمار ہوتی تھی اور اس قوم میں حضرت داؤدؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت سلیمانؑ جیسے عظیم الشان پیغمبر ہوئے لیکن خدا کی نافرمانیوں اور پیغمبروں کی تکذیب کے جرم میں یہ قوم ذلیل و رسوا ہوئی فرعون کے زمانے میں انہیں ہندو مذہب کے شودروں سے بھی کم تر سمجھا جاتا تھا۔

اس قوم نے اپنے مذہب میں قابلِ جرم اخلاقی ناقدری کی اور انہوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہنا شروع کر دیا اور پیغمبر کو اللہ کے بیٹے کا درجہ دیکر شرک کیا۔

عیسائیت اور تصورِ خدا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدا کا جو تصور پیش کیا یعنی وہ واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں، اسے عیسائی ادب نے عقیدۂ تثلیث کی نذر کر دیا۔ اس کے بعد اسکندریہ کے بادشاہ سارل نے حضرت مریمؑ کو بھی تثلیث کا ایک لازمی جزو قرار دیا اور ان کی شان میں اناجیل لکھیں اور مورتی کو پوجا جانے لگا۔ اس سے پہلے تثلیث کے جزو باپ (اللہ) بیٹا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) اور روح القدس (حضرت جبرائیل علیہ السلام) تھے۔

اسلام کا خدا اور انسانیت کیلئے اسکی قبولیت

جب انسان نے خدا کے متعلق سوچا تو ایک طرف اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور دوسری طرف یہ سوچا کہ ہم معمولی ضروریات کیلئے دوسروں کے محتاج ہیں تو خدا بھی اتنی بڑی کائنات چلانے کیلئے کسی کی مدد ضرور لیتا ہوگا۔ اور اسی خیال نے انسانی ذہن میں شرک کا تصور پیش کیا۔

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا۔ یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا۔ بدھ مت نے خدا کا کوئی تصور پیش نہیں کیا۔ جہاں تک زرتشت کا تعلق ہے تو اس نے دو خدا کا تصور پیش کیا یعنی ایک خدا بدی کا اور دوسرا نیکی کا۔ اسلام کا خدا ہر وقت ہر جگہ اپنے بندوں کے ساتھ ہے خواہ وہ کھلے آسمان کے نیچے ہوں یا زمین کے اندر اسلام کا خدا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو۔ میں آواز سننے کے لئے موجود ہوں اور فرمایا کہ جب میری طرف سے ہدایت آئے تو جو اس کی پیروی کریگا اس کیلئے کچھ غم و فکر نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہبری کیلئے پیغمبر بھیجے اور صاف کہہ دیا میری ہدایت عام ہے جس میں قوم ملک رنگ و نسل کی قید نہیں اور اس کی نظر میں سب برابر ہیں۔

الغرض دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے خدا کا وہ تصور پیش کیا جو نہ صرف آج بلکہ ہر دور کے انسان کیلئے قابل قبول ہے اور اللہ پاک نے فرمایا کہ میں نے نہ صرف تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ بلکہ میری خوشی بھی یہی ہے کہ تم دین اسلام پر کاربند ہو جاؤ۔

منصبِ رسالت

(اسلام)

اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام لوگوں تک پہنچانے کیلئے رسول بھیجے۔ انسان کیلئے یہ بات ضروری تھی کہ وہ خدا کی رضا کیلئے اس کی مرضی، احکام اور پسند معلوم کرے اور یہ باتیں انسان میں خود دکھائی نہیں دے سکتیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس بے کسی کو سمجھ لیا۔ چنانچہ اس نے یہ انتظام کر دیا کہ پیغمبر بھیجنے شروع کر دیئے اور اس انتظام کا نام "رسالت" رکھا اور اس پر ایمان لانا "مسلم" ہونے کے لئے ضروری قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب سے پہلے جس انسان کو بھیجا اسے نبوت کا درجہ بھی دیا۔ جوں جوں آبادی بڑھتی گئی خدا کی تعلیم کم ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ تعلیم فراموش کر دی گئی۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ہدایت کیلئے انبیاء بھیجتا رہا جو مختلف مقامات اور زمانوں میں آئے۔

۱۔ اگرچہ انبیاء عام انسانوں سے بلند تھے لیکن وہ سب انسان تھے۔

۲۔ رسالت محنت سے نہیں ملتی بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہے جسے اللہ چاہے عطا فرما دے۔

۳۔ پیغمبر دین اور شریعت جو کچھ بھی انسانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور وہی کہتے ہیں جس کا حکم ہوتا ہے۔ پیغمبر کی ساری تعلیمات خدا کی طرف سے ہوتی ہیں

۴۔ ہر نبی معصوم ہوتا ہے اور اس سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ تمام انبیاء کو ماننا ہر مسلمان کا فرض ہے یہودیت انبیائے بنی اسرائیل کے علاوہ کسی کا اقرار فرض نہیں اور عیسائیت میں پیغمبرِ اسلام کی توہین کی جاتی ہے۔

رسالت کا مقام انبیاء کے بارے میں ہر زمانے میں لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا رہے۔ بعض نے انہیں خدا یا خدائی میں شریک کر لیا حالانکہ انبیاء نے اس کی مسلسل تردید کی ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے انبیاء کی تعظیم ہر مسلمان پر فرض ہے۔

ختم نبوّت

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے نبی ہیں۔ آپؐ کے ہاتھوں میں دین کی تکمیل ہوئی۔ آپ کی شریعت نے پہلی تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔ اور اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء کیا کرتے تھے اور ایک نبی کی وفات کے بعد دوسرا نبی جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا بلکہ خلیفہ ہوں گے۔ رسالت اور نبوّت کا سلسلہ ختم ہو گیا میرے بعد نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔

اِسلام

تعریف موجودہ دور کے مذاہب میں اسلام ایک اہم مذہب کی خصوصیت کا حامل ہے اور تعداد کے لحاظ سے عیسائیت کے بعد اسی کا نمبر آتا ہے۔ دنیا میں اس وقت اس کے جاننے والوں کی کل تعداد ۷۰ کروڑ یعنی تقریباً کل دنیا کی تہائی کے برابر ہے۔

اسلام صرف وہ مذہب نہیں جسے صرف حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا بلکہ یہ وہ اسلام ہی ہے جس کی تبلیغ و اشاعت حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضرت صلعم نے کی یہ سب حقیقی معنوں میں مسلم تھے البتہ ان کے پیروں نے ان کی تعلیمات میں ردوبدل کر دیا جس کی وجہ سے یہ مختلف نظر آتے ہیں۔ اسلام کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ گذشتہ مذاہب کے مقابلہ میں اس کی تعلیمات نہایت جامع مکمل اور صحیح ہیں۔ اس کی انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک ہدایات موجود ہیں۔ اسلام میں اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی پہلو یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تبلیغ عملی نمونے کے ساتھ کی۔ اس کے بعد اور کسی قسم کے مذہب کا تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں فرما دیا ہے۔

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔" یعنی آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام پر کاربند رہنے کیلئے ہمارے لئے ہدایت کے دو نمونے عطا کئے یعنی قرآن اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور فرمایا۔

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول

یعنی تابعداری کرو اللہ اور اس کے رسول کی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر حکم خداوندی اپنی امت تک پہنچانے سے پہلے اس پر خود

عمل کیا اور کر کے دکھایا۔ اگر امت کو پانچ وقت نماز پڑھنے کا حکم دیا تو خود نماز میں اس قدر مشغول ہو گئے کہ پاؤں مبارک پر ورم آ گیا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول آپؐ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہیں تو پھر اس قدر عبادت کیوں۔ آپؐ نے فرمایا کیا میں اللہ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں۔

آپؐ نے اگر مسلمانوں کو صبر کی تعلیم دی اور بھوک اور پیاس کا مقابلہ کرنے کے لئے ابھارا اور صحابہ کرام نے اس پر اس طرح عمل کیا کہ جب بھوک کی شدت بڑھتی تو وہ اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے۔ لیکن آپ کا یہ حال تھا کہ غزوہ خندق کے موقع پر جب صحابہ کرام نے بھوک کی تکلیف بیان کی اور اپنے پیٹ دکھلائے کہ جن پر ایک ایک پتھر بندھا ہوا تھا۔ مگر جب آپؐ نے اپنا بطنِ مبارک ظاہر کیا تو اس پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔

یہ اور ایسے بہت سے مواقع ہیں ملیں گے کہ حضور اکرم صلعم نے ہر ہر قدم پر نہ صرف اپنی امت کی پوری رہبری فرمائی بلکہ اس کا عملی ثبوت بھی پیش کیا۔ جو کہ بہت بڑا امتیاز ہے۔

اسلام کے بنیادی عقائد

انسان کے تمام اعمال کا دار و مدار اس کے خیالات پر ہے اور عام خیالات کا انحصار انسان کے چند پختہ اصولی خیالات پر ہوتا ہے۔ انہی اصولی خیالات کو عقائد کہا جاتا ہے۔ درحقیقت عقیدہ ہی وہ بنیاد ہے جس سے انسان کا ہر عمل وابستہ ہے۔

اسلامی تعلیمات میں دل ہی وہ بنیاد ہے جس کی درستگی پورے جسم کی درستگی اور جس کی خرابی پورے جسم کی خرابی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ:۔

"خبردار انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جو اگر بگڑ گیا تو پورے جسم میں فساد پیدا ہوگا اور اگر سدھر گیا تو پورا جسم سدھر گیا۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ دل ہے۔"

ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کیلئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح ضروری ہے آنحضرتؐ کی تعلیم نے علم اور عمل کو ایک دوسرے کے لئے لازمی قرار دیا۔ آپؐ نے نہایت واضح الفاظ میں عقائد کیلئے پانچ اصول متعین فرمائے یعنی اللہ پر ایمان اس کے فرشتوں پر ایمان۔ اس کے رسولوں پر ایمان اس کی کتابوں پر ایمان اور آخرت کے دن پر ایمان۔

یہ وہ حقیقتیں ہیں جن پر دل سے یقین اور زبان سے اقرار ضروری ہے۔ لہٰذا ہر ایک

پر مختصراً بحث کی جاتی ہے ۔

۱- خدا پر ایمان

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور ہم سے پہلے جو لوگ گذرے انہیں پیدا فرمایا۔ وہی پورے جہان کا خالق و مالک ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے کیونکہ اِن اللہ علی کل شیئٍ قدیر ۔ اس کی خصوصیت ہے اس نے پورے جہان کے انسان و جنات کو اس لئے پیدا کیا کہ ان کی عبادت کریں جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے وما خلقت الجن والانس الا یعبدون یعنی میں نے جنات اور انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

ہم پر اللہ تعالیٰ کی اتنی نعمتیں ہیں کہ اگر ہم انہیں بھولنا بھی چاہیں تو نہیں بھول سکتے کیونکہ فبایّ آلاء ربکما تکذبان ۔

لہٰذا ہمیں ہر طرف سے ہٹ کر صرف اور صرف اس کی عبادت کرنی چاہیئے تاکہ ہم دین و دنیا میں کامیابی حاصل کر سکیں ۔ اور پرہیزگار بن جائیں جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے ۔

یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون۔

۲- فرشتوں پر ایمان

فرشتہ اللہ تعالیٰ کی ایک نورانی مخلوق ہے جنہیں قرآن کے الفاظ میں ملائکہ کہا گیا ہے اور اکثر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا ذکر ملتا ہے۔ جیسا کہ جب نبی کریم پر درود بھیجنے کے لئے کہا گیا تو وہاں یہ بات بھی بیان کر دی گئی ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کے فرشتے بھی حضور صلعم پر سلام بھیجتے ہیں ان اللہ وملٰئکتہ یصلون علی النبی یعنی اللہ اور اس کے فرشتے بھی نبی کریم صلعم پر سلام بھیجتے ہیں۔

فرشتے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ قرآنی آیت انہی کی زبان بیان کرتی ہے۔ "نحن نسبح بحمدک ونقدس لک ...."

اس کے علاوہ اہم فرشتے چار ہیں ۔ اور ان چاروں کے کام مختلف ہیں۔

۱- حضرت جبرائیل علیہ السلام :- ان کے ذمہ پیغمبروں تک خدا کا حکم پہنچانا ہے

۲- حضرت میکائیل علیہ السلام :- ان کا کام لوگوں کی بنیادی ضروریات بہم پہنچانا

ہے یعنی رزق وغیرہ۔

۳۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام :۔ ان کا کام اللہ کے حکم سے روح قبض کرنا ہے۔

۴۔ حضرت اسرافیل علیہ السلام :۔ یہ قیامت کے سلسلہ میں خدمت انجام دیں گے۔

الغرض اللہ کے فرشتوں پر اس کی مخلوق ہونے کی حیثیت سے ایمان لانا ضروری ہے۔

۳۔ رسولوں پر ایمان

اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے اس لئے کہ وہ ہم تک اللہ کے احکام پہنچاتے ہیں۔ اگر ان کی صداقت کو تسلیم نہ کیا جائے تو احکامِ الٰہی کی سچائی بھی مشکوک ہو جائیگی۔ اللہ کے رسول وہ برگزیدہ انسان ہیں جنہیں اس نے اپنے احکام کی عملی تفسیر کیلئے مختلف زمانوں میں مختلف اقوام کی طرف بھیجا جیسا کہ حکم خداوندی ہے :۔ "ما کنا معذبین حتی نبعث رسولا"

اللہ کے ان پیغمبروں کا یہ کام ہے کہ وہ اس کے احکام اس کے بندوں تک پہنچائیں اور پیغمبروہی تعلیم دیتے ہیں جو انہیں وحی کی جاتی ہے یعنی "ان ھی الا وحی یوحی"

یعنی میں وہی کہتا ہوں جو مجھے وحی کیا جاتا ہے۔

دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے اور ہمارا یہ عقیدہ ہونا چاہیئے کہ سب انبیاء برحق ہیں اور آنحضرت صلعم سے قبل ہر ایک کی تعلیمات ان کے زمانے تک محدود تھیں۔ جن میں اب ردو بدل ہو چکا ہے جبکہ آنحضرت صلعم کی تعلیمات اسی طرح آج بھی موجود ہیں جیسے آپکے زمانے میں تھی۔ اس لئے کہ آپ تمام عالم کیلئے بھیجے گئے۔

وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین

آپ کے بعد نہ تو کوئی رسول آئیگا اور نہ کسی دوسری تعلیمات کی ضرورت ہے اس لئے کہ آپؐ نے فرمایا :۔ انا خاتم النبیین لا نبی بعدی۔

۴۔ اللہ کی کتابوں پر ایمان

اللہ پر ایمان لانے کے بعد لازمی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس نے انسان کی ہدایت کیلئے مختلف انبیاء کو جو تعلیمات دیکر بھیجا ان پر ایمان لانا بہت ضروری ہے۔ قرآن کریم کی ایک آیت متقین کی جو خصوصیات بیان کرتی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ :۔

"والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک"

کتابوں پر ایمان لانے کیلئے ہمارا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ آجتک جو کتابیں بھی خواہ وہ موجود ہوں یا نہ ہوں اللہ کی جانب سے برحق ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ قرآن سے پہلے جو کتابیں بالخصوص توریت انجیل زبور میں بعد ازاں ردوبدل کر دیا گیا ہے جبکہ قرآن کریم اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔ اس میں ردوبدل کرنا ناممکن ہے کیونکہ اس کی حفاظت اللہ تبارک تعالی نے اپنے ذمہ لے لی ہے جبکہ اس سے قبل کی کتابوں کے بارے میں ایسا کوئی حکم نہیں۔ اللہ تبارک کا ارشاد ہے:۔ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔ یعنی ہم نے اسکو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

۵۔ آخرت پر یقین

مذکورہ بالا چار بنیادی عقائد پر ایمان لانے کے بعد آخرت پر یقین رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی تعلیمات پر عمل کرنے اور نہ کرنے والوں کے درمیان امتیاز ہو سکے۔

آخرت پر یقین رکھنے کے بعد انسان خود بخود برے کاموں سے بچ جاتا ہے اس لئے کہ جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ ایک دن ایسا آئیگا کہ اسے اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہوگا تو وہ ہر اس کام سے بچنے کی کوشش کریگا جس کا نتیجہ اچھا نہ ہو۔

اللہ سے ڈرنے والوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں "وبالاخرۃ ھم یوقنون" آخرت کا دن جسے ہم یوم سزا و جزا بھی کہتے ہیں۔ انسان کے ہر چھوٹے سے چھوٹے اچھے اور برے عمل کے تجزیے کا دن ہے قرآن کا ارشاد ہے کہ "ومن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ" یعنی اس دن انسان اپنے ذرہ بھر عمل کو بھی دیکھ لیگا۔

یوم آخرت پر یقین رکھنے کے بعد ایک بہترین معاشرہ جنم لے سکتا ہے اور اس طرح اس عقیدہ کا تعلق نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی بھی ہے آخرت کے بارے میں یہ ہمارا پختہ یقین ہونا چاہئے کہ مرنے کے بعد جب تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائیگا تو اللہ تعالی ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق سزا دیگا۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں اچھے کام کئے ہوں گے وہ اللہ کی بیش بہا نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ جبکہ برے اعمال کے لوگ خسارے اور گھاٹے میں ہوں گے

اسلام میں خدا کا تصور

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کے ہر مذہب میں خدا کا تصور کسی نہ کسی طرح موجود رہا ابتدا میں کبھی اس تصور کے بارے میں جب انسان نے از خود سوچنا شروع کیا تو اس کے ذہن میں مختلف خیالات نے جنم لیا۔ ایک طرف تو اس نے کبھی ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر پر اپنے پختہ یقین کا اظہار کیا اور دوسری طرف یہ بھی سوچنے لگا کہ جس طرح ہم انسان اپنی ضروریات پوری کرنے کے سلسلے میں اپنے ساتھ دوسروں کے تعاون کو بھی ضروری سمجھتے ہیں اسی طرح خدا بھی کائنات کو قائم رکھنے کے سلسلہ میں مجبور ہے کہ اپنے ساتھ کسی کو شریک کرے۔ اسی خیال نے شرک کا تصور پیدا کیا۔

تصورِ خدا کے سلسلے میں اگر ہم مختلف اہم مذاہب کا مطالعہ کریں تو ہمارے سامنے یہ بات کھل کر آجاتی ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے خدا کو اس کی صحیح حقیقت و حیثیت میں پیش کیا۔

پرانے مذاہب میں یہودیت کو اس پر ناز ہے کہ اس نے سب سے پہلے توحید کا سبق دیا لیکن تاریخ گواہ ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد خود یہود نے حضرت عزیز علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔

وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰہِ ۔

اس کے بعد عیسائیت کا نمبر آتا ہے جس نے نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا بلکہ آپ کو، آپ کی والدہ کو اس طرح خلط ملط کیا کہ عیسائیت ایک معمہ بن گئی۔

جہاں تک ہندومت و بدھ مت اور زرتشت کا تعلق ہے ان میں کوئی بھی مذہب وحدانیت کا قائل نہیں۔ اگر کہیں عقیدۂ ثنویت ہے تو کہیں تری مورتی کا عقیدہ ہے۔ بہر کیف اسلام کے علاوہ ہر جگہ ہمیں بہت سے خداؤں کا تصور ملے گا۔

اسلام کا خدا ہر وقت زندہ اور بیدار ہے۔ وہ نہ صرف قہار و جبار ہے بلکہ اپنے بندوں پر حد درجہ مہربان بھی ہے وہ ہر وقت اور ہر جگہ اپنے بندوں کے ساتھ جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے :۔ وھو معکم این ما کنتم ۔ یعنی تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے ۔

اللہ فرماتا ہے تم مجھے پکارو میں سننے کیلئے موجود ہوں ۔ " ادعونی استجب لکم " یعنی مجھے پکارا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ خدا تعالیٰ صرف کائنات کا ہی بنانے والا نہیں بلکہ

اپنی کائنات کے ہر ذرہ کی خبر رکھتا ہے۔ اس نے جب انسان کو پیدا کیا تو اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑا بلکہ فرمایا کہ :۔

فاما یاتینکم منی ھدیً فمن تبع ھدای فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون ۔

یعنی جب میری طرف سے ہدایت آئے تو جو شخص اس کی پیروی کریگا تو اسے کوئی خوف و اندیشہ نہ ہوگا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی رہبری کیلئے انبیاء کی صورت میں بھی ہدایت فرمائی۔ الغرض دنیا کے تمام مذاہب میں سے اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے خدا کا وہ تصور پیش کیا جو ہر لحاظ سے قابلِ قبول ہے۔

پرچہ پنجم

فلسفہ اور اسلامی فلسفہ

فلسفہ سے مراد دانش اور حکمت ہے۔ اور یہ یونانی لفظ کا ترجمہ ہے۔ ارسطو کے نزدیک فطرت کے جامع نکتہ نظر کی تلاش کا نام فلسفہ ہے۔

اسلامی فلسفہ کو سمجھنے سے پہلے فلسفہ اور اس کے ارتقار کا مختصر تعارف ضروری ہے۔ ہربرٹ اسپنسر کے نزدیک فلسفہ منظم علم کا نام ہے۔ فلسفہ کی بنیاد عمیق فکر اور تخلیق تفکر پر ہے اس میں الہام روحانیت اور کشف کو دخل نہیں، بلکہ اس میں سوچ اور جستجو سے مسائل کا حل ہوتا ہے۔

فلسفہ کا مقصد دراصل ہر چیز کی حقیقت معلوم کرنا ہے۔ اور اس طرح یہ علم کائنات کے تمام علوم پر محیط ہے۔ فلسفہ کی تین شاخیں ہیں (۱) اخلاقیات (۲) منطق (۳) مابعد الطبیعات۔ فلسفہ کا علم نہ تو ریاضی ہے جس میں دو ضرب دو ہمیشہ معین، مستقل ہیں۔ اور نہ ہی کیمسٹری ہے کہ عمل میں ہمیشہ ایک ہی جیسی اشیار حاصل ہوں گی۔ فلسفہ اپنی اساس اور عمل کے لحاظ سے سائنس یا ریاضی کے مقابلے میں بالکل مختلف ہے۔

فلسفی تمام مسائل کی تشریحات، نتائج اور حل اپنے فکر اور گہری سوچ سے پیدا کرتا ہے۔ نہ تو اس میں کسی تجربہ کو دخل ہوتا ہے، اور نہ ریاضی کے کلیات کو۔ تمام ماہرین فلسفہ منطق سے کام لیتے ہیں۔ فلسفہ کے میدان میں بحث کرنے کے لئے دلائل پیش کرنے پڑتے ہیں، جبکہ دلائل کو پیش کرنے کے لئے منطق کی ٹھوس علم کی ضرورت ہے۔

فلسفہ اور یونان

فلسفہ کے میدان میں مسلمانوں سے پہلے سب سے وسیع کام یونانیوں نے سرانجام دیا۔ اور فلسفہ کو ایک باقاعدہ مضمون کی حیثیت دی۔ ارسطو یونان کا سب سے بڑا فلاسفر مانا جاتا ہے جو کہ افلاطون کا شاگرد تھا۔ عیسائیت کی ترویج کے بعد یونانی فلسفہ بہت متاثر ہوا۔ اور عیسائیت اور یونانی فلسفے کے امتزاج سے نوافلاطونی فلسفہ پیدا ہوا۔ جس کے بعد اسلامی ظہور ہوا تو اس وقت نوافلاطونی فلسفہ دنیا کی ہر تہذیب میں مروج تھا اسلام سے قبل لوگوں کا نظریہ تھا کہ انسان کے پاس حواس اور عقل کے علاوہ اور کوئی ذریعۂ علم نہیں۔

انسان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ طرح طرح کی مشکلات کو برداشت کرتے ہوئے زندگی کے بنیادی مسائل کے حل کے لئے عقل کی رہنمائی میں سفر کرتا رہے۔ جب کہ اسلام نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زندگی کے مسائل کے حل کے لئے انسان کو تنہا عقل کے سپرد نہیں کیا گیا بلکہ ایک اور ذریعہ علم ہے جسے وحی کہتے ہیں، اور یہ ہر انسان کو حاصل نہیں۔ بلکہ خاص خاص شخصیتوں کے ذریعہ نوعِ انسانی کو دیا گیا۔ کیونکہ اسلام صرف نظریاتی اصولوں اور سماجی قوانین کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک زندہ اور ترقی پذیر نظام ہے اور قرآن حکیم پر اس کی بنیاد قائم ہے۔ قرآن صرف ایک مذہبی کتاب نہیں بلکہ تقریباً ۳۰۰ علوم کا مجموعہ ہے۔

یونان کے پہلے دور میں جو افلاطون اور ارسطو سے قبل کا دور ہے، فلسفہ نے جنم لیا۔ انسانوں نے زمین اور آسمان کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ خالق اور مخلوق۔ کائنات اور انسان۔ حیات بعدالموت۔ نیکی بدی وغیرہ کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ ان سب پر انسان نے اپنے تفکر سے سوچنا شروع کیا۔ کیونکہ انسان اپنے حواس سے صرف مادی دنیا کے متعلق ہی اطلاعات فراہم کرسکتا ہے۔ اس لئے اس کی یہ سوچ سائنس کا علم ہو گیا جو کہ فطرت سے تعلق رکھتا ہے، فلسفہ انسان کے تجربہ سے نہیں بلکہ تفکر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے وہ اس کے ذریعہ تقریباً افکار و قدرت کو جان سکتا ہے۔

اسلام نے بڑی حد تک فلسفہ کی ضرورت کو ختم کردیا۔ کیونکہ اسلام نے خالق و مخلوق کائنات خیر و شر اور روح و جسم جیسی گتھیوں کو سلجھا دیا۔ اور ان کے متعلق عقائد اور تفصیلات فراہم کیں۔

فلسفی ان تمام باتوں کا جواب محض عقل سے دیتا ہے اور چونکہ انسان کا علم و عقل محدود ہے۔ اس لئے جہاں تجربہ و مشاہدہ ممکن نہیں وہاں پر صرف قیاس و گمان ہی سے کام لیا جاتا ہے جس کو صحیح نہیں مانا جاسکتا۔ چنانچہ جب عقل انسانی زندگی کے حقائق دریافت کرنے سے قاصر ہے تو ایک ایسے علم کی ضرورت خود بخود اہمیت کی حامل ہوجاتی ہے جو حیات انسانی کے بنیادی مسائل کو احسن طریقے سے حل کرتے ہوئے انسانی زندگی کو صحیح راہ پر گامزن کرسکے۔ اور وہ ذریعہ علم وحی ہے۔ جو کہ ایسی ہستی کی جانب سے ہے جس کے لئے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حل اسلام نے پیش کیا۔ وہ بھی ایسا حل جس سے ذہنِ انسان کو سکون و اطمینان میسر ہوسکتا ہے۔

اسلامی فلسفہ میں عالم یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے مسائل میں اسلامی اصولوں کے حلقے اور اپنی تحقیق کے ہر پہلو سے قرآن وحدیث اور اسلامی فقہ کے مسائل کے اندر رہتے ہوئے اپنے کلام سے دلائل دے کر مذہب کی تائید کرے۔

مسلمان مفکرین کے لئے خدا حق۔ اس کا رسولؐ حق۔ اس کی کتاب لاریب ہے۔ چونکہ یہ تینوں سچّائی پر مبنی ہیں۔ اور انسان کے مسائل کا ایسا حل پیش کرتے ہیں جو محض ظن وتخمین پر مبنی نہیں۔ چنانچہ اسلامی فلسفے سے مراد" زندگی کے بنیادی مسائل کا حل قرآن وسنّت کے دلائل اور مذہب کی حدود کے اندر رہ کر پیش کرنا ہے۔

کوئی مذہب بھی حکمت وفلسفہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ ایمانیات کا سارا کارخانہ دلیل پر ہی قائم ہے۔ اگر اسلام میں خدا تعالیٰ کا ایک مخصوص تصور ہے اگر اس حقیقت کا یقین کرنا ضروری ہے کہ روح کو دوام کی منزلیں طے کرنا ہیں۔ ؟

اگر یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ فرشتوں کا کوئی وجود ہے۔ نیز اگر نبوت اللہ کی بخشش و انتخاب کا غیر معمولی ظہور ہے تو ان سب عقیدوں کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے ایک طرز عمل کا ہونا ناگزیر ہے اور یہ طرز عمل اسلامی فلسفہ کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔

اسلامی عقلی بنیادوں کی تلاش پیغمبر کے ہی عہد سے شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ آپؐ دعا کرتے تھے" رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا " اگرچہ فلسفہ یونان سے مسلمان مفکرین کے نکتہ نظر کو بہت وسعت حاصل ہوئی۔ لیکن بہت جلد مسلم مفکرین نے یہ محسوس کر لیا کہ یونانی اور بالخصوص نوافلاطونی فلسفہ اور اسلامی فلسفہ میں کافی حد تک تضاد موجود ہے۔ چنانچہ قرآن کی جلا بخشنے والی تعلیمات کو جب مسلم مفکّرین نے احادیث کی تشریح کے ساتھ اپنایا تو یہ فلسفہ "فلسفہ اسلامی" کہلایا۔ یعنی جب اسلام کی حدود میں قائم رہتے ہوئے اسلامی ماخذ کی روشنی میں انسانی مسائل پر اگر غور وفکر کیا جائے۔ تو اسے" اسلامی فلسفہ" کہتے ہیں۔

اسلامی فلسفہ نے خالق وکائنات کے متعلق یہ حل پیش کیا کہ اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

کائنات کی تشکیل کے متعلق اسلامی فلسفہ نے کہا کہ یہ کوئی کھیل اور تفریح کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر غور وفکر کرنا چاہیئے اور اس کی تشکیل اس طرح ہوئی کہ اس میں وسعت واضافہ کی گنجائش موجود ہے اور اس کو انسان کے فائدہ کے لئے بنایا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا

کائنات کی اہم چیزوں یعنی چاند اور سورج کے متعلق کہا کہ ان کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے نہ کہ تم ان کے لئے۔ وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ

انسان کی پیدائش کا مقصد بیان کرتے ہوئے یہ واضح طور پر ذہن نشین کروا دیا ہے کہ اس کا مقصد عبادت ہے۔

"وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ؕ

روح کی حقیقت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" کہ یہ تو صرف امر ربّی ہی ہے۔

موت و زیست کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ

"خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ"

آخرت کے متعلق یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ وہ نتائج کا گھر ہے۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ

انسان کے منصب کے متعلق کہا گیا۔

"جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً"

اور اس کے ساتھ ہی اسے اشرف المخلوقات کا اعزاز بخشا گیا، نیز کہا

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ"

الغرض وہ تمام مسائل جن کے متعلق انسان نے صدیوں سے سوچنا شروع کیا تھا اور اس کا کوئی مناسب حل نہ پا سکا تھا اور جس کے لئے اس نے ایسے فلسفے پیش کئے کہ ہر ایک کے مابین تفریق پیدا ہو گئی، ان سب کا اسلام نے نہایت فطری طور پر صحت کے ساتھ اس طرح حل پیش کیا کہ اطمینان و سکون میسّر آ گیا۔

شاہ ولی اللہؒ کا نظریہ سعادت

سعادت :۔ انسان جن خصوصیات کی بنا پر انسان کہلاتا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں وہ عظیم الشان کمال موجود ہوں جس سے باقی مخلوق محروم ہے۔ اور اسی کمال کا نام سعادت ہے۔

جیسے افلاطون، ارسطو اخلاقی کمال کو "خیر اعلیٰ" کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح شاہ ولی اللہؒ اخلاقی غرض و غایت حصول سعادت کو قرار دیتے ہیں۔

سعادت کے مختلف درجات

جس طرح انسان اپنی استعداد میں مختلف ہیں اسی طرح وہ عام خصوصیات مثلاً اخلاق، شجاعت وغیرہ میں بھی مختلف ہوتے ہیں۔ بعض میں حصول سعادت کا جذبہ پوری طرح موجود ہوتا ہے اور بعض میں بالکل نہیں۔ چنانچہ ایسے لوگ جو اپنی پیدائش ہی میں سعادت سے محروم ہیں اور کسی طرح کا بیرونی اثر بھی قبول نہیں کر پاتے ان کے لئے قرآن کا ارشاد ہے۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ۙ

اور بعض صرف رہبری کے محتاج ہوتے ہیں۔ یعنی

؏ اگر نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

شاہ صاحب کے نزدیک سعادت کے حصول کے دو ہی طریقے ہیں۔

(۱) انسان اپنے نفس کو زمان و مکان کی قید سے اس قدر آزاد کر دے کہ اس کی خواہش عام انسانوں کی خواہش سے مختلف ہو اور اس کا خوف دوسرے لوگوں سے مختلف ہو اور وہ خدشات کے شکنجے میں آنے والا نہ ہو۔ تو سعادت کا یہ وہ مقام ہے۔ جو صوفیہ، حکما اور مجاذیب کو حاصل ہو۔

(۲) غیر ضروری خواہشات سے پرہیز کیا جائے۔ اور نفس کو درست کرنے کی کوشش کی جائے یعنی عقل قوت بہیمیہ پر غالب ہو جائے۔

اور یہ دوسرا طریقہ عام مشہور ہے اور سعادت کے ان طریقوں پر پہنچنے کے لئے چار بنیادی

فضائل شاہ صاحب نے بیان فرمائے۔

(۱) طہارت (۲) اخبات (۳) سماحت (۴) عدالت

طہارت :۔ جب اخلاق رزیلہ سے پاک انسان دنیاوی خواہشات میں ملوث ہوتا ہے تو اس پر رنج وغم اور تنگ دلی چھا جائے گی اور اس کی زندگی خباثتوں میں غبار آلود ہونے لگتی ہے اور وہ قوت بہیمہ کی تابعداری کے قریب ہو جاتا ہے اور شیطانی وسوسے اس پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔ پس اگر وہ جلدی آگاہ ہو کر ان جسمانی اور روحانی کر توتوں سے جدا ہو کر پاک ہو جائے تو اس کی نفسیاتی کیفیت کو وہ روحانی صفات حاصل ہوتی ہیں جو اسے اونچے مقام تک پہنچا دیتی ہیں اور اس میں بھلائی قبول کرنے کی اور ایک اچھا انسان بننے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے اور اسی کیفیت کا نام طہارت ہے۔

(۲) اخبات :۔ اخبات ایک ایسی کیفیت ہے جس کا تعلق ذوق اور وجدان سے ہے اور جس کو تحریر میں لانا مشکل ہے۔ پس اس کی مثال اس طرح ہے جیسے ایک جاہ وجلال والے بادشاہ کے دربار میں ایک عام اور بے حیثیت والے انسان کی ہوتی ہے یعنی اس کیفیت میں انسان اپنے آپ کو اللہ کی جناب سے بے چارہ اور عاجز پاتا ہے! اس مقام پر وہ اللہ کی صفات پر غور کرتا ہے۔ اس کی نشانیوں کا ذکر کرتا ہے اور اس کا سارا جسم پاکیزہ اخلاق کا تابع ہو جاتا ہے۔

(۳) سماحت :۔ اگر نفس قوت بہیمہ کے اسباب سے باغی ہو جائے اور اس پر کوئی برائی نہ تو منقش ہو سکے اور نہ ہی اس کے اثرات اس تک پہنچ سکیں۔ ایسی کیفیت کا نام سماحت ہے۔

یہ کیفیت تکالیف کے برداشت میں صبر کہلاتی ہے اور مالی معاملات میں سخاوت اور خواہشات نفسانی سے بچنے کی صورت میں عفت۔ یعنی اس کیفیت میں انسان اعتدال پسند ہو جاتا ہے اور تمام برائیوں پر غالب آ جاتا ہے۔

(۴) عدالت :۔ جب انسان ایسی خصوصیات کا مالک بن جائے جس سے باآسانی اجتماعی اور انفرادی نظام کا قیام ممکن ہو جس میں عام کام بھی عبادت کی طرح ہونے لگیں تو ایسی کیفیت کا نام عدالت ہے۔

یہی وہ چار بنیادی صفات ہیں جو اگر پوری طرح انسان میں پیدا ہو جائیں تو وہ

اعلیٰ کمالات کا مالک بن جاتا ہے اور حصول سعادت حاصل کر کے خیر کثیر کو پاتا ہے۔ اس میں صالحین کے درجہ سے لیکر انبیاء کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اسلامی نکتہ نظر سے انسان سعادت کے کسی بھی درجہ پر پہنچ جائے مگر نبوت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ نبوت جد وجہد کے دائرے سے باہر ہے اور اللہ کی دَین ہے۔

مذہب و اخلاق کا تعلق

علمائے اسلام نے علم الاخلاق کے انفرادی اور اجتماعی دونوں گوشوں کی خدمت بڑی نظر بندی فکر و عمل تجربات، مشاہدات کے ساتھ انجام دی ہے۔ ان کی بنیاد ظن اور تخمینی دلائل اور اوہام کی آمیزش سے متاثر نتائج پر نہیں بلکہ سراسر حقائق یقینیات اور وحی الٰہی کے زیر اثر محکم اور روشن احکامات پر ہے۔ اسلام دراصل صحیح عقائد، کریمانہ اخلاق اور اعمال حسنہ کے مجموعے کا نام ہے۔ انسان اگر خدا کی وحدانیت کا یقین رکھتا اور شرک سے بیزاری ظاہر کرتا ہے۔ تو جس طرح یہ ایک مذہبی عقیدہ ہے اسی طرح اسلام کی نگاہوں میں ایک کریمانہ خلق بھی ہے۔ اس طرح اگر وہ منکر توحید اور مشرک ہے تو وہ فلسفیانہ اخلاق میں قابل گرفت نہ ہو مگر اسلامی علم الاخلاق میں وہ جس طرح باطل عقیدے کا حامل ہے اسی طرح اللہ کے ان حقوق و فرائض کے پیش نظر جو مخلوق ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہیں۔ نہ بد اخلاق بھی ہے اسی طرح دوسرے عقائد و ارکان دین (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کا حال ہے کہ ان امور میں غلط روی اور بے اعتنائی حقوق اللہ سے پہلو تہی یا انکار کے مترادف ہے۔ اس لئے مذہب کی نگاہ میں گناہ بھی ہے اور بد اخلاقی بھی اگرچہ علم الاخلاق کی بول چال میں وہ کریم الاخلاق ہی کیوں نہ شمار ہوتا ہو۔ نیز بہت سے ایسے مذہبی احکام ہیں جو اگرچہ اخلاق کی صفت میں جگہ پاتے ہیں مگر مذہبی نقطۂ نگاہ سے اس لئے بھی واجب العمل ہیں کہ وہ احکام الٰہی اور فرائض مذہبی ہیں۔

اس تفصیل کا مطلب یہ ہے کہ علم الاخلاق کا اسلامی نقطۂ نظر عام علمی نقطۂ نظر سے زیادہ وسیع زیادہ بلند اور ابدی اور سرمدی ہے، کیونکہ علم الاخلاق کا علمی نظریہ ایک صاحب اخلاق کو لذت سعادت منفعت یا خیر کے اس مثال اعلیٰ تک ہی پہنچا دینے کا کفیل ہے جو فانی دنیا کے دائرے میں محدود ہے۔ لیکن اسلامی علم الاخلاق ہر قسم کے دنیوی سعادتوں کے ساتھ ساتھ ابدی و سرمدی سعادت و خیر کی مثل اعلیٰ تک رسائی سے بھی واسطہ رکھتا ہے جو مذہب میں عالم آخرت، عالم روحانیت اور رسول اللہ کے عنوانات سے جانا جاتا ہے ایسی صورت میں یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اخلاق کا علمی اور عملی پہلو فلسفیانہ علم الاخلاق کی علمیات کی حدود سے بہت آگے اور بعض خصوصی اساس و بنیاد کے اعتبار سے بلند تر ہے۔

لہٰذا یہ کوشش بیکار ہوگی کہ ہم اندھی تقلید کے ساتھ ساتھ اس سلسلہ کے ہر شعبہ میں دوزیل کا خواہ مخواہ ہم آہنگ کا ثبوت دیں، اس لئے کہ اخلاق اسلامی کو عقائد اسلامی سے بالکل جدا کر لینا اس کی اصل حقیقت کو فنا کر دینے کے برابر ہے۔ البتہ یہ صحیح ہوگا کہ ہم اخلاق اسلامی کے صرف انہی شعبوں کو زیر بحث لائیں جو مذہب کے ساتھ ساتھ عام علم اور مذہب کی نگاہ میں بھی علم الاخلاق کے شعبے شمار ہوتے ہیں اور چونکہ اسلام اس کا بجا طور پر مدعی ہے کہ وہ دین فطرت ہے اور عقل سلیم آزادی و افکار کا مظہر ہے تو بلا شبہ اس کے علم الاخلاق کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہونا چاہیے جو عقل سلیم اور فکر سلیم کے مخالف اور اس کے متصادم ہو۔ اگرچہ اس کے بعض شعبے انسانی عقل و فکر کی دسترس سے آگے اور جاری حیات سے ماورا بھی ہیں علم الاخلاق تعلیمات اسلامی کا ایک اہم جزء ہے اور جس طرح اسلام کے دینی اور دنیاوی قوانین ہر گوشے میں کامل اور مکمل ہیں۔ اس طرح اس گوشے میں بھی وہ ایک بے نظیر اور بلند مرتبہ قانون کا پیغامبر ہے اسلام کے داعی محمدؐ نے اپنی بعثت کا سب سے بڑا مقصد اخلاق کے عروج کمال ہی کو بتایا ہے۔

اِنِّیْ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ

"میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کریمانہ کو اس کی آخری بلندیوں تک پہنچا دوں"۔

قرآن مجید نے آپ کے لئے سب سے بڑا شرف آپ کے اخلاق ہی کو قرار دیا ہے۔

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ۔

بے شک آپؐ عظیم الشان اخلاق کریمانہ کے حامل ہیں۔

اگرچہ موجودہ دور علمی میں علم الاخلاق کے مباحث۔ علم الاجتماع کے نقطہ نظر سے بہت پھیلے ہوئے ہیں، تاہم حقیقی اور بنیادی افادیت کے پیش نظر علمی اور عملی دونوں گوشوں میں علماء اسلام کے مباحث اخلاق سے آج بھی آگے نہیں ہیں۔ اس لئے ہم علم الاخلاق کے بارے میں علماء اسلام کے چند نظریئے پیش کرتے ہیں:۔

امام غزالی نے خُلق کی مندرجہ ذیل تعریف کی ہے۔

"خُلق نفس کی ایک ایسی کیفیت اور ہیئت راسخ کا نام ہے جس کی وجہ سے بہ سہولت اور بغیر فکر و توجہ کے نفس سے اعمال صادر ہو سکیں"۔

پس اگر یہ ہیئت اس طرح قائم ہے اس سے عقل و شرع کی نظر میں اعمال حسنہ صادر ہوتے

ہیں تو اس کا نام خلق حسن ہے اور اگر اس سے غیر محمود افعال سرزد ہوتے ہیں تو اسے خُلق سیّئہ کہتے ہیں۔

محقّق "دوانی" فرماتے ہیں:۔

"نفس ناطقہ انسان میں دو قوتیں ہیں (۱) قوت ادراک (۲) قوت تحریک اور دونوں قوتوں کی پھر دو، دو شاخیں ہیں۔

(۱) قوت ادراک کی ایک شاخ کا نام عقل نظری ہے اور یہ علمی صورتوں کے قبول کے لئے مبدا ءِ تاثیر بنتی ہے۔

(۲) اور دوسری شاخ کا نام عقل عملی ہے اور یہ افعال جسزویہ کی فکر و مشاہدے کے وقت تحریک بدنی کے لئے مبدا ءِ بعید ہوا کرتی ہے (اور محرک قریب خود نفس ہوتا ہے یا ارادہ) اور پھر یہ شاخ قوت غضب اور قوت شہویہ کے تعلق کے وقت ایسی چند کیفیات کے وجود کا مبدا ء بنتی ہے جو فعل یا انفعال کا سبب ہو۔ مثلاً ندامت اور ہنسی یا رونا وغیرہ۔ نیز وہم اور قوت متخیلہ کے استعمال کی حیثیت جزوی ادار اور جزوی اعمال کے استنباط کا مبدا بھی ثابت ہوتی ہے۔

اس طرح قوت تحریک کی پہلی شاخ کا نام قوت غضبی ہے اور یہ مبدا بنتی ہے۔ ایسی مدافعت کا جو غلبے کے ذریعے ناپسندیدہ اور نامناسب امور کو رفع کرتی ہے۔

دوسری شاخ کا نام شہویہ ہے اور یہ مناسب اور پسندیدہ امور کو حاصل کرنے کے لئے مبدا ہے اور قوت ادراک کا یہ فرض ہے کہ تمام قوئ بدنی پر اس طرح مسلط ہو جائے کہ کسی طرح ان قوئ سے منفعل اور متاثر نہ ہونے پائے بلکہ تمام قوئ اس کے تسلط اور قبضہ میں آجائیں۔ اور جس قوت سے جو کام لینا چاہے لے سکے اور کسی قوت کو اس کے حکم کے بغیر کسی قسم کے اقدام کی جرأت نہ ہو سکے تاکہ انسانی ضمیر کی راجدھانی میں نظم و ضبط صحیح رہ سکے اور کسی قسم کا خلل نہ واقع ہو،

جب ان قوتوں میں سے ہر ایک قوت بہ مقتضائے عقل اپنے خصوصی فعل پر اقدام کرے گی، تو قوت ادراک یعنی عقل فطری کی تہذیب و ترتیب سے حکمت حاصل ہوگی۔ اور عقل عملی کی تہذیب سے عدالت پیدا ہوگی۔ قوت غضبی کی تہذیب و ترتیب سے شجاعت اور قوت شہوت کی تہذیب و ترتیب سے عفت صالح وجود میں آئے گی۔ اس تقریر کی بنا پر عدالت قوت عملی کا نام ہے نہ کہ قوت عملی کے کمال کا۔

افلاطون کا نظریہ خیر اعلیٰ

اخلاقی نظریات میں جو تضاد پایا جاتا ہے اس میں اس بات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ کسی نظام اخلاق میں لذت کو کیا مقام حاصل ہے۔ بعض لذت کو اصل مقصد حیات سمجھتے ہیں اور بعض کے نزدیک نیکی لذّت سے گریز کا نام ہے۔

اس بات کے ثبوت کے لئے کہ لذت خیر اعلیٰ نہیں ہو سکتی افلاطون نے حسب ذیل لائل پیش کئے ہیں:۔

(۱) جب کسی عاقل ہستی کو خیر اعلیٰ مل جائے تو اسے مکمل اطمینان حاصل ہو جائے گا جبکہ لذت کے اندر یہ چیزیں نہیں کیونکہ لذت تو انسان کی نسبت کیڑے مکوڑوں کو زیادہ حاصل ہے

(۲) انسان کی لذّت کے ساتھ ساتھ علم و شعور بھی چاہتا ہے کیونکہ خالی لذت سے اس کو کل اطمینان نہیں ملتا۔

(۳) خیر مطلق جہاں کہیں بھی ہو وہ خیر ہی رہے گی۔ ایک لذت کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں دوسری لذت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تضاد ہو وہاں مکمل اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا یعنی نفس اطمینان کی حد تک نہیں پہنچتا۔

(۴) اکثر جسمانی لذتیں کسی تکلیف کے رفع ہونے سے پیدا ہوتی ہیں اور جو چیز چاہت کی پیداوار ہو حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی اور اگر کسی لذت کو حاصل کرنے کے لئے تکلیف اٹھانی پڑے تو اس سے بے لذت اچھا۔

(۵) افلاطون کے نزدیک بہترین لذت تکلیف سے مُبّرا ہوتی ہے اس لئے عملی لذتیں باقی تمام لذتوں پر فوقیت رکھتی ہیں۔

(۶) صحیح زندگی خواہشات کو پورا کرنا نہیں بلکہ نصب العین کی طرف بڑھنے کا نام ہے! انسان فانی ہے لہٰذا اس کی حاصل کی ہوئی تمام لذتیں بھی فانی ہیں۔

(۷) کیونکہ انسان فانی ہے اس کے ختم ہوتے ہی لذتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں اس لئے اسے کمال اور خیر اعلیٰ کے حصول کے لئے کوشش کرنا چاہیئے جو ہمیشہ رہے گی۔

الغرض انسان کے لئے فضیلت یا نیکی یہی ہے کہ وہ خیر اعلیٰ کے حصول کے لئے کوشش

کرے اور وہ اس وقت تک انسان نہیں کہلا سکتا جب تک اس کی زندگی عقل کے تحت نہ ہو اور جب زندگی عقل کے تحت ہوگی تو فضیلت حاصل ہوگی اور خیر اعلیٰ کا حصول ہوگا۔

علم الکلام

دنیا میں عموماً ہر قوم کو مذہب ہر چیز سے زیادہ عزیز رہا لیکن مسلمانوں کو بہت زیادہ عزیز تھا اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ مسلمان کسی نسل، خاندان، ملک یا افراد کا نام نہیں بلکہ مسلمان قومیت کا عنصر صرف مذہب ہے۔

مسلمانوں نے اپنے مذہب کو ہر قسم کے خطرات سے بچانے کے لئے ہر زمانے میں حیرت انگیز کوششیں کیں۔ عباسی دَور حکومت میں جب یونان اور فارس کے ذخیرے عربی زبان میں آئے اور تمام قوموں کو مذہبی مباحثوں اور مناظروں میں جب عام آزادی دی گئی تو اسلام کو ایک بڑے خطرے کا سامنا پیش آیا۔ پارسی، عیسائی اور یہودی ہر طرف سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور فتوحات اسلام کے آغاز میں ان کو اسلام کی تلوار سے جو صدمہ پہنچا تھا اس کا انتقام قلم سے لینا چاہتے تھے انھوں نے اسلامی عقائد و مسائل پر آزادانہ اور بے باکی سے نکتہ چینی کی یہاں تک کہ کمزور عقیدہ کے مسلمانوں کے عقائد متزلزل ہو گئے۔

اسلام نے جہاں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی رہنمائی کی ہے وہاں پر اس دنیا کے بعد کی زندگی کا بھی تصور موجود ہے۔ اسلام کی رُو سے انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا بدلہ اسے ضرور مل کر رہے گا اور یہ انصاف کا تقاضا بھی ہے

اسلام میں انسان کو نیک راہ پر گامزن کرنے کے لئے جہاں طرح طرح کی خوش خبریاں دی گئی ہیں وہاں اسے بُری راہ سے بچنے کے لئے وعید بھی کی گئی ہے اور کہا ہے کہ ہم جب قبروں میں پہنچیں گے حقیقت حال کا علم ہوگا جس کی تفصیل قرآن کریم کی سورہ تکاثر میں موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہوس کو اس کا خسارہ قرار دیا اور کہا ہے کہ "وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ" البتہ وہ اس خسارے سے ایمان اور نیک اعمال کی برکت ہی سے نہ صرف بچ سکتا ہے بلکہ اپنے لئے بے پناہ اجر بھی کما سکتا ہے۔

اسلام نے آخرت کے بارے میں نہایت واضح طور پر یہ بتا دیا ہے کہ اس دن انسان وہی کچھ حاصل کرے گا جو اس نے پہلی دنیا میں اپنے لئے بویا ہوگا۔ اس دن کسی سے کسی بھی قسم کا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائیگا اور نہ کوئی اللہ کے حکم کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے گا۔ وہاں پر اسکی

کامیابی کا دارومدار صرف اور صرف اچھے اعمال پر ہوگا جس کا موقع انسان کو اس مادی دنیا میں فراہم کیا گیا ہے۔

اس وقت مسلمان حکومت کے زور سے اگر چاہتے تو مخالفوں کی زبانیں بند کر سکتے تھے لیکن مسلمانوں کی آزاد خیالی نے اس عیب کو گوارا نہ کیا بلکہ علما اسلام نے نہایت شوق اور محنت سے فلسفہ سیکھا اور مخالفین کا مقابلہ انہیں کے ہتھیار سے کیا۔ اور یہی علم آج علم الکلام کے نام سے مشہور ہے۔

علم الکلام اور اختلاف عقائد

(۱) جب اسلام پھیل کر ایران۔ یونان وغیرہ میں پہنچا تو وہاں کے لوگ جو کہ بال کی کھال نکالنے کے عادی تھے انہوں نے اسلام کو بھی نہیں بخشا اور اسلامی عقائد اور اعمال پر نکتہ چینیاں کی جانے لگیں۔

(۲) جب اسلام میں مختلف قومیں داخل ہوئیں تو اُن کے وہ پرانے عقائد جو کہ اسلامی تعلیمات میں کسی بھی طرح پائے جاتے تو وہ فوراً بحث شروع کر دیتے۔ مثلاً یہودیوں کے ہاں "خدا ایک مجسم ہے، اس کی آنکھیں دُکھتی ہیں۔ فرشتے عیادت کرتے ہیں اور کبھی وہ کسی پیغمبر سے کشتی لڑتے ہوئے چوٹ کھا جاتا ہے۔ اس قسم کے عقائد کے لوگ جب اسلام لائے تو ان کا ذہن لازمی طور پر ان کی آیات کی طرف زیادہ ہوگا جن میں خدا کی نسبت ہاتھ وغیرہ کے الفاظ ذکر کیے گئے ہیں۔

(۳) اسلام میں خود بعض مسائل ایسے ہیں کہ جب ان کے متعلق رائے قائم کی جائے تو اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ مثلاً اختیار کا مسئلہ۔ یعنی ایک طرف تو ہم اپنے آپ کو فاعل خود مختار سمجھتے ہیں جبکہ دوسری طرف ہم خدا کے حکم کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔

(۴) چوتھا سبب عقل و نقل کا ہے۔ خدا نے انسان میں دو قسم کی طبیعتیں رکھی ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جو ہر بات کو عقل سے سمجھتے ہیں اور جسے عقل قبول نہ کرے اسے ماننے کے لئے تیار نہیں جبکہ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو ایسی بحث سے کوئی کام نہیں۔ پس وہ جب بھی کوئی بات کسی بزرگ سے سُن لیتے ہیں تو بلا جھجک اسے اپنے لئے فرض سمجھتے ہیں۔

(۵) اختلاف عقائد کا سب سے بڑا سبب طریق معاشرت کا اختلاف تھا۔ محدثین اور فقہاء اپنے ہم مذہبوں کے علاوہ کسی سے نہ ملتے اور نا ہی غیر مذاہب کے لوگوں کے اعتراضات پر دھیان رکھتے۔ نیز ہر ایسے سوال کا جواب جو قرآن و حدیث میں نہ ہوتا بدعت کہہ کر خاموش کر دیتے۔

(۶) اختلافات کی ایک اہم وجہ ملکی ضرورت بھی تھیں۔ بنو امیہ کے زمانے میں جبکہ قتل و غارت کا دور دورہ تھا تو جب عوام زبان پر حرف شکایت لاتے تو حکومت کا ساتھ دینے والے علماء یہ کہہ کر معصوم عوام کو خاموش کر دیتے کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ خدا کی مرضی ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت حجاج بن یوسف کا زمانہ ہے۔

ان تمام رنگینیوں کا ایسا جواب دینے کے لئے جو کہ عقل بھی ماننے پر مجبور علم الکلامؔ کیا گیا۔

اقسام علم الکلام

علم الکلام اگرچہ ایک مخلوط مجموعہ مسائل کا نام ہے لیکن حقیقت میں اس کی دو جداگانہ اقسام ہیں۔ ایک علم الکلام تو وہ ہے جو خاص اسلامی فرقوں کے باہمی جھگڑوں سے پیدا ہوا ایک مدت تک بڑی وسعت سے پھیلتا رہا اور اس کی بدولت بڑے بڑے ہنگامے ہوئے۔ اس میں نہ صرف قلم بلکہ تلوار سے بھی کام لیا گیا اور اسلام کی ملکی طاقت کو اس سے بڑا نقصان پہنچا۔

دوسرا علم الکلام وہ ہے جو فلسفہ کے مقابلہ کے لئے ایجاد ہوا۔ امام غزالی کے زمانے تک دونوں بالکل الگ الگ رہے۔

امام غزالی نے اختلاط (پیار و اخلاص) کی بنیاد ڈالی سا امام رازی نے اسے ترقی دی اور متاخرین نے اس قدر ایک دوسرے کو ملا دیا کہ فلسفہ، کلام اور اصول عقائد سب گڈمڈ ہو کر ایک معجون مرکب بن گیا۔

علم الکلام عقلی

یہ وہ علم الکلام ہے جو فلسفہ کے مقابلہ میں ہوا۔ اسلام جب تک عرب میں محدود رہا عقائد کے متعلق کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہ تھی کیونکہ عربوں کا اصل مذاق تخیل نہیں بلکہ انہیں تو صرف عمل سے سروکار تھا لیکن جب اسلام عرب سے دوسرے ممالک تک پہنچا تو اس کا واسطہ یونانی فلسفیوں سے بھی پڑا جو کہ ہر چیز کو تجربہ اور عقل کی بنیاد پر سمجھنے کے عادی تھے جہاں تک اس کا سوال ہے کہ علم الکلام کو علم الکلام کیوں کہا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی وجہ تو یہ بتائی جاتی ہے کہ سب سے پہلے اختلاف جو پیدا ہوا وہ کلام الٰہی کے متعلق تھا اور اسی مناسبت سے اس علم کا نام کلام پڑ گیا لیکن جب ہم بعد کے دور کو دیکھتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب فلسفہ کے مقابلہ کے لئے بھی یہی نام استعمال کیا گیا تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس علم میں چونکہ بحث و مباحثہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے

اور بحث کا تعلق کلام سے ہے اس لئے ہم اس علم کو علم الکلام کہتے ہیں۔

علم الکلام کی مخالفت

علم الکلام کے پیدا ہوتے ہی محدثین نے نہایت زور و شور سے اس کی مخالفت کی۔ امام شافعی رح۔ احمد بن حنبل اور سفیان ثوری اور اکثر محدثین نے اس کو حرام قرار دیا۔ امام شافعی کا قول تھا کہ اہل کلام کو درّے لگنے چاہئیں لیکن بعد میں جب وہ خطرات جن کی گھنٹی علم الکلام سے سنائی دی تو امام غزالی جیسے شخص نے بھی علم الکلام کی ترویج و تدوین کے لئے کافی کوشش کی۔

وجہ مخالفت

علم الکلام کی مخالفت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ علمار کلام اپنی تصنیفات میں مخالفین کے اقوال نقل کر کے جواب دیتے اور محدثین اس کی نقل کو بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔

امام احمد ابن حنبل کے زمانے میں حارث مبی بہت بڑے زاہد اور محدث تھے اور حضرت جنید بغدادی انہی کے مرید تھے لیکن اس عظیم محدث نے جب شیعہ اور معتزلہ کی رد میں ایک کتاب لکھی تو امام حنبل صاحب ان سے اس قدر ناراض ہوئے کہ ملنا تک چھوڑ دیا۔

ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ علمار کلام اکثر عقائد میں محدثین سے اختلاف کرتے مثلاً جب وہ ایسی حدیث سنتے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ میں مناظرہ ہوا اور آسمان فرشتوں کے بوجھ سے چرچرا اٹھا خدا قیامت کے دن اپنی ران دوزخ میں ڈالے گا تب دوزخ کو تسکین ہوگی، تو علمار کلام ان احادیث کو یا تو تسلیم ہی نہ کرتے یا ان کی تاویل کرتے جو کہ محدثین کے لئے قابل قبول نہ تھی

ایک دفعہ ہارون رشید کے دربار میں آدمؑ اور موسیٰؑ کی یہ حدیث بیان کی گئی جس پر ایک شخص نے کہا کہ آدم اور موسیٰ اکٹھے کس طرح ہو گئے تو بجائے اس کا جواب دینے کے ہارون الرشید نے انکار حدیث پر اس شخص کو قتل کروا دیا۔

الغرض اگرچہ علم الکلام نے عقائد اسلام کو اتنا پیچیدہ بنا دیا کہ سادہ لوح مسلمان اس کو نہ سمجھ سکتے تھے لیکن مخالفین اسلام کے تابڑ توڑ حملوں کا جواب دیکر جو خدمت اس نے انجام دی ہے اس کی بنا پر علم الکلام کی اہمیت اپنی جگہ موجود ہے۔

معتزلہ کی تاریخ

معتزلہ نے اموی عہد میں بال و پر نکالے اور زمانۂ عباسیہ میں یہ فرقہ کافی عرصہ تک اسلامی فکر پر حاوی رہا۔ اس فرقہ کے ظہور کے متعلق دو مختلف رائے ہیں:۔

۱۔ یعنی۔ جب حضرت حسینؓ امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے تو اصحاب علیؓ کی ایک جماعت سیاست سے بالکل الگ ہو گئی اور ان کی سرگرمیاں صرف عقائد تک محدود ہو گئیں اور یہی معتزلہ کہلائے۔

۲۔ علماء کا ایک بڑا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ معتزلہ کی ابتداء حضرت حسن بصریؒ کے زمانے سے ہوئی اس لئے کہ آپ کے حلقۂ درس میں واصل بن عطا نامی ایک شخص شریک تھا اس زمانے میں اس بات پر بڑی بحث تھی کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان ہے یا نہیں۔

واصل نے حسن بصری سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ "میں کہتا ہوں کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب پورا مسلمان نہیں بلکہ وہ کفر و ایمان کی درمیانی منزل میں ہے۔

اس اختلاف کے بعد واصل نے حسن بصری کے حلقۂ درس سے علیحدگی اختیار کر کے اسی مسجد میں ایک علیحدہ حلقہ قائم کر لیا۔

علماء معتزلہ کا کہنا یہ ہے کہ ہمارا فرقہ واصل سے بہت پہلے سے ہے۔ البتہ اسے واصل سے اس لئے منسوب کیا جاتا ہے کہ اس نے اس کی تبلیغ و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور اس کا بانی تصوّر کیا جانے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ یہودیوں میں ایک "فروشیم" کہلاتا تھا جس کے معنی معتزلہ کے ہیں اور یہ فرقہ بھی تقدیر پر بحث کرتے ہوئے اس بات کا یقین رکھتا تھا کہ بندوں کے سب افعال خدا کے پیدا کردہ نہیں۔ ممکن ہے یہود سے جو لوگ اسلام لائے انہوں نے اسی مماثلت کی وجہ سے اس گروہ کو یہ نام دیا ہو۔ نیز علامہ مقریزی کا قول بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

معتزلہ کے عقائد

معتزلہ حسب ذیل پانچ اصولوں کے بڑی شدت سے معتقد تھے :-

(۱) توحید (۲) عدل (۳) وعدہ وعید (۴) کفر و اسلام کی درمیانی منزل،

(۵) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

۱۔ توحید :-

معتزلہ توحید کے ماننے والے ہوتے ہیں اور خدا کی ذات و صفات میں ذرہ بھر بھی کسی کو شریک نہیں سمجھتے اور اسی اصول کے تحت قیامت کے دن رویت باری تعالےٰ کو محال سمجھتے ہیں تاکہ اس کی صفت میں کوئی چیز شامل نہ ہوسکے۔

۲۔ عدل :-

معتزلہ کے ہاں عدل کا مطلب یہ ہے کہ خدا فساد نہیں چاہتا۔ وہ وہی حکم دیتا ہے جو اراد؟ رکھتا ہے۔ اس نے جس نیکی کا بھی حکم دیا وہ اس کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ وہ بندوں کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ وہ چاہتا تو لوگ کبھی گناہ نہ کرتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ایسا کرتا تو بندوں کی آزمائش کس طرح ہوتی۔

۳۔ وعدہ وعید :-

معتزلہ کا پختہ عقیدہ ہے کہ اللہ نے ثواب کا جو وعدہ اور سزا کی جو دھمکی دی ہے وہ پوری ہو کر رہے گی۔ نیز اسے مخلصانہ توبہ قبول کرنے کا جو وعدہ کیا ہے وہ بھی پورا ہوگا اور نیکی کی جزا اور بدی کی سزا مل کر رہے گی۔

۴۔ کفر و اسلام کی درمیانی منزل :-

معتزلہ کے نزدیک ایمان ایک خصلت ہے اور صاحب ایمان مومن ہے جو کہ ایک توصیفی نام ہے۔ چونکہ فاسق میں نیک خصلتیں جمع نہیں ہوسکتیں اس لئے وہ اس توصیفی نام کا مستحق نہیں، اسے مومن تو نہیں کہہ سکتے لیکن کافر بھی نہیں کہا جاسکتا اس لئے کہ وہ کلمہ شہادت کا قائل ہے اور کچھ نیک کام بھی کرتا ہے لیکن اگر اس کی موت اس طرح واقع ہوئی کہ اس نے کوئی گناہ کبیرہ کیا تھا اور توبہ نہیں کی تو وہ دوزخی ہے۔ البتہ اس کے ساتھ اتنی رعایت ہوگی کہ وہ کافروں سے ایک درجہ اوپر ہوگا۔

۵۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر:

معتزلہ کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سب مومنین پر واجب ہے تاکہ اسلام کی تبلیغ ہو سکے۔ اسی اصول کی بنا پر معتزلہ نے دور عباسیہ میں الحاد و کفر کا خوب مقابلہ کیا اور بڑی بڑی قربانیاں دیں۔

معتزلہ نقلی دلائل کے بجائے عقلی دلائل پر زیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ وہ اپنے مسائل کو عقل پر پیش کرتے ہیں اور جو عقل کے خلاف ہو اسے رد کر دیتے ہیں وہ ہر چیز کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ بھی عقل ہی کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ خدا صرف اس فعل کو انجام دینے کا حکم دیتا ہے جس میں اصلاح ہو۔

معتزلہ کے افکار پر یونانی فلسفہ کا کافی اثر پایا جاتا ہے اور انھوں نے بڑی حد تک اس سے استفادہ بھی کیا۔ الغرض معتزلہ کے عقیدہ کی بنیاد قرآن کی اسی آیت پر ہے:۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ!!

یعنی کیا ہم نے تمہیں دو آنکھیں، زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور کیا تمہیں سیدھا راستہ نہیں دکھادیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود معتزلہ کے زمانے میں موجود محدثین و فقہاء ان کے سخت خلاف تھے جس میں شافعی، احمد بن حنبل۔ ابو یوسف اور ابو محمد قابل ذکر ہیں لیکن خلفاء عباسیہ نے معتزلہ کی پشت پناہی کی اور اس حد تک کہ لوگوں کو زبردستی معتزلہ بنانا چاہا کہ انہوں نے فقہاء اور محدثین تک کو نہیں بخشا اور ان پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھائے لیکن ان لوگوں نے بھی معتزلہ کے خلاف اپنی تبلیغ جاری رکھی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کی ہمدردیاں ان حضرات کے ساتھ ہو گئیں اور معتزلہ کی شہرت کو نقصان پہنچنے لگا یہاں تک کہ امام مالک اور امام شافعی کسی معتزلہ کی شہادت قبول نہ کرتے تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود معتزلہ کی ان خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو انہوں نے اسلام کے دفاع کیلئے سرانجام دیں۔

اشاعرہ

اشعری فرقہ دراصل معتزلہ کے رد عمل کی بنا پر وجود میں آیا۔ اس کے بانی ابو الحسن اشعری ہیں جنہوں نے اس فرقہ کی بنیاد ابو موسیٰ اشعری کے اس قول پر رکھی جو انہوں نے

حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے جھگڑے میں ثالث کی حیثیت سے فرمایا۔ یعنی "اللہ تعالیٰ کائنات میں جو کچھ بھی کرے اسے ظلم نہیں کہا جا سکتا" معتزلہ نے محدثین اور فقہاء پر جو ظلم ڈھائے ان کی وجہ سے لوگ انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ چونکہ انھیں خلیفۂ وقت کی سرپرستی بھی حاصل تھی اس لئے انھوں نے اپنی من مانی کروانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ لیکن جب عباسی خلیفہ متوکل کا زمانہ آیا تو اس نے معتزلہ کے بجائے اُن کے مخالفین کی سرپرستی کی جو لوگ قید و بند میں مبتلا تھے انھیں رہا کرایا لہٰذا اب وہ لوگ بھی جو معتزلہ کے خوف سے ان کے خلاف آواز نہ اٹھا سکتے تھے میدان میں نکل آئے۔

ان میں کچھ ایسے علماء بھی تھے جو مناظرات میں معتزلہ سے بھی بڑھ کر بصیرت رکھتے تھے معتزلہ کے حق میں تیز ترین تلوار سے کم نہ تھے۔ ان میں ابوالحسن اشعری اور ابو منصور ماتریدی قابل ذکر ہیں۔ جن میں اگرچہ باہمی اختلافات تھا لیکن انھوں نے معتزلہ کے خلاف جدوجہد کی

اشاعرہ کا طریقۂ کار

اشاعرہ نے معتزلہ کا مقابلہ انھیں کے ہتھیار یعنی فلسفہ سے کیا اور معتزلہ اس میدان میں اشاعرہ کے خلاف نہ جم سکے کیونکہ اشاعرہ میں امام ابوجعفر جیسے فلسفی اور فکری حضرات شامل تھے جو عقلی اور نقلی دونوں علوم میں باکمال تھے۔ نیز امام اشعری جنہوں نے اگرچہ تعلیم معتزلہ کے شیخ ابوعلی جبائی سے حاصل کی لیکن ان کا رجحان محدثین اور فقہاء کی جانب تھا، وہ کچھ عرصہ تو تنہائی میں رہے اور دونوں کا خوب موازنہ کرتے رہے اور پھر معتزلہ سے بے رغبتی کا اظہار کر دیا اور باقاعدہ ان پر اعتراضات بھی پیش کئے۔

اشاعرہ کے عقائد

اشاعرہ کہتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف بھیجا اسے تسلیم کرتے ہیں نیز خدا کو واحد، یکتا اور بے نیاز قرار دیتے ہیں اور اس کے سوائے کوئی معبود نہیں۔ وہ بیوی اور اولاد نہیں رکھتا محمدؐ خدا کے بندے بھی اور رسول بھی ہیں۔ جنت اور دوزخ برحق ہیں، قیامت ضرور ہوگی، اور جو لوگ قبروں میں دفن ہیں ان کو حیاتِ نو بخشی جائے گی۔

ہم اللہ کے کلام کو غیر مخلوق سمجھتے ہیں۔ بندوں کے اعمال خدا کے پیدا اور مقرر کردہ ہیں۔ ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ جو تکلیف ہمیں پہنچی وہ ٹلنے والی نہ تھی۔ قیامت کے دن خدا کو

مومن اس طرح دیکھے گا جیسے چودھویں کے چاند کو۔ ہم گناہوں کی بنا پر مسلمانوں کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کرتے۔ اور ہمارا ایمان ہے حضور اکرم کی شفاعت پر بہت سے لوگ دوزخ سے نجات پائیں گے۔ نیز ہم اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور بزرگان دین کو دل سے چاہتے اور ان کی محبت پر ایمان رکھتے ہیں۔

محدثین اور فقہاء اور معتزلہ کے مابین جو اختلافات ظاہر ہو چکے تھے ان میں اشاعرہ معتزلہ کے خلاف تھے وہ اہل بدعت سے متنفر تھے اور ان کا مسلک اعتدالی تھا یعنی امام اشعری ایک ایسے مسلک کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے جو ہر قسم کی بدعت سے پاک ہو۔

ائمہ نے عقائد پر استدلال کرتے ہوئے عقل ونقل دونوں راہیں اختیار کیں۔ انھوں نے کبھی بھی معتزلہ کا طرز و انداز اختیار نہیں کیا

اشاعرہ ابوالحسن اشعری کے بعد

امام اشعری کے جاں نثاروں کی تعداد کم نہ تھی اس لئے اس مسلک نے بہت ترقی کی اور بڑے بڑے ممتاز علماء نے اس مسلک کو اختیار کیا جن میں ابوبکر باقلانی جیسی شخصیتیں شامل ہیں انھوں نے امام اشعری کی بحث کو از سر نو مرتب کیا اور اثبات توحید کے لئے امام صاحب نے جو عقلی دلائل ابتداءً ذکر کئے تھے ان پر روشنی ڈالی۔

باقلانی کے بعد امام غزالی کا نام قابل ذکر ہے جنھوں نے امام اشعری کی تقلید میں فلاسفہ کے نکتہ نظر کی مخالفت کی اور کہا کہ فلسفی نظریہ مذہبی فکر کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ الغرض معتزلہ کے مقابلہ میں اشاعرہ نہ توحد سے بڑھنے والے ہوا اور نہ نقطۂ آغاز۔ بلکہ افراط اور تفریط کی درمیانی راہ یعنی اعتدال پسندی کو اختیار کیا۔

تصوف:۔ تصوف ایک ایسا مسلک ہے جس کی آج تک کوئی جامع تعریف نہیں پیش کی جا سکی کیونکہ یہ ایک ذاتی تجرباتی، ذوقی اور وجدانی شئے ہے لہٰذا تمام علماء کا ایک بات پر متفق ہونا ناممکن ہے اس لئے کہ ہر ایک کا ذوق و وجدان جدا ہے جس کا جتنا زیادہ ذوق ہوگا اتنی ہی وہ حقیقت کو سمجھے گا۔

تاریخی پس منظر:۔ صوفی کو لقب کی حیثیت سب سے قبل آٹھویں صدی کے آخر میں کوفے کے ایک شیعہ کیمیاگر کو دی گئی جس کا نام جابر بن حیام تھا جو کہ جوہر میں ایک خاص مسلک رکھتا تھا اور اس لفظ کو ایک نامور صوفی ابو ہاشم کے ساتھ بھی استعمال کیا گیا۔

البتہ اسلام میں تصوف کا نام بہت پہلے سے موجود تھا۔ چنانچہ ہجویری نے اپنی کتاب میں ایک نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"آج کل تصوف ایک نام ہے بغیر حقیقت کے لیکن گذشتہ زمانے میں ایک حقیقت تھی بغیر نام کے"

اس قول سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ نام صحابۂ کرام اور سلف صالحین کے زمانے میں موجود نہ تھا لیکن اس کی حقیقت ہر شخص میں جلوہ گر تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تاریخی اعتبار سے تصوف کی جڑیں رسول اللہؐ کی گوشہ نشینی کے زمانے عمل سے پائی جاتی ہیں جو وحی کے نزول سے قبل رسول اللہؐ خصوصاً ماہِ رمضان میں غارِ حرا میں فرمایا کرتے تھے۔

امام غزالی نے تصوف کو "قرب الٰہی" اور "ذوق" سے تعبیر کیا ہے۔ خلفاء راشدین کے زمانے تک تصوف یعنی قرب الٰہی کی شدید خواہش ہر ایک میں اتنی شدید تھی کہ اس کا اثر پوری امت میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس زمانے میں جماعتوں اور گروہوں کی کوئی واضح شکل موجود نہ تھی پھر بھی تابعین نے خود بخود ہی صحابۂ کرام کے حلقوں سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا تھا اور روایت کے مطابق اس قسم کے اہم صوفی حلقوں میں حضرت علیؓ کا نام تھا اور اس کے علاوہ حسن البصری مجاہدین زبیر وغیرہ تھے۔

الغرض صوفیائے کرام نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق تصوف کی جو تاریخ پیش کی ہے ان میں سے چند کو پیش کیا جاتا ہے:۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں:۔ کہ

"صوفی وہ لوگ ہیں جنہوں نے تمام کائنات میں صرف اللہ تعالیٰ کو پسند کیا" مگر اس

سلسلہ میں سب سے جامع تعریف حضرت جنید بغدادی رح کی ہے آپ کا فرمان ہے کہ "صوفی وہ ہے جس کا دل دنیا سے متنفر اور حکم خداوندی ماننے والا ہو۔ اس میں تسلیم حضرت اسمٰعیل کی طرح، اندوہ حضرت داؤد علیہ السّلام کی طرح۔ فقر حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی طرح، صبر حضرت ایوب علیہ السلام کی طرح۔ شوق حضرت موسٰی علیہ السّلام کی طرح اور اخلاق حضرت جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح۔"

تصوف کے سلسلہ میں پیش کردہ اقوال سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر بزرگ نے تصوف کو اپنے اپنے ذوق اور وجدان کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی ہے البتہ تصوف کو احادیث نبی میں تلاش کیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جو شخص احکام الٰہی کو اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کر کے محسن بن جائے وہی صوفی ہے اور اس کا یہ احسان تصوف ہے۔ حدیث قدسی میں احسان کے بارے میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ

اِنْ تَعْبُدُ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ وَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ۔

یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے۔

تصوف دیگر مذاہب کی نظر میں

بدھ مت اور ہندو مت کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو ان دونوں کے ہاں تصوف صرف اس حقیقت کا نام ہے کہ معاشرے کی ذمہ داریوں سے خود کو الگ کر کے زندگی بھر طرح طرح کی مشکلات کے سپرد کر دیا جائے یعنی اپنے جسم پر سخت ترین مشقت کو لازم کر دیا جائے اور خدا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے ان سے منہ پھیر لیا جائے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو بالکل فنا کر دیا جائے اور اللہ تعالٰی نے حقوق العباد کی جو اہم ترین ذمہ داری انسان کے سپرد کی ہے اسے پورا نہ کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ اگر تصوف کے اس نظریہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی زندگی بھی مجروح ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔

عیسائیت میں تصوف کو یہ مقام دیا گیا کہ انسان صرف اور صرف خداوند یسوع مسیح

کے سپرد اپنے آپ کو کردے اور اسی نظریہ نے پادریوں کا گروہ پیدا کیا جو بعد میں چرچ کے نام پر بادشاہوں پر بھی فوقیت لے گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس پاپایت نے انسانیت پروہ ظلم ڈھائے کہ جن کا تصور بھی کرتے ہوئے روح کانپ اٹھتی ہے۔

اسلام کے نقطہ نظر سے اگر تصوف کو دیکھا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تصوف اللہ کی صحبت، رسولؐ کی پیروی، ایثار، قناعت اور احسان کا دوسرا نام ہے۔ ایثار اور ہمدردی مسلمانوں کا خاص شیوہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ہجرت فرمائی تو مسلمانان مدینہ نے ایثار کی وہ مثال پیش کی جس کا جواب تاریخ انسانی آج تک نہ دے سکی۔ نیز اسلام میں تصوف اس کا نام نہیں کہ دنیا سے کنارہ کشی کر کے صرف اللہ ہی کے حقوق ادا کئے جائیں کیونکہ اسلام کے نزدیک رہبانیت کی کوئی قدر نہیں۔ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ۔ بلکہ اسلام تو اس کی تعلیم دیتا ہے کہ الدنیا مزرعۃ الآخرۃ "یعنی دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

الغرض اسلام میں تصوف کا بہت بڑا مقام ہے اور ہر دور میں بندگان خدا نے اس سلسلہ سے اپنے آپ کو متعلق رکھا ہے۔

سلسلہ صوفیہ

صوفیائے کرام کے متعدد سلسلے ہیں اور ان سب کا ربط حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک صحیح اور ثابت ہے اور یہ سب حُبّ الٰہی کی تعلیم دیتے ہیں۔

صوفیہ کے چند مشہور سلسلے حسب ذیل ہیں:-

(۱) چشتیہ (۲) نقشبندیہ (۳) قادریہ (۴) سہروردیہ۔

(۱) چشتیہ:-

یہ سلسلہ حضرت خواجہ اجمیریؒ کے ذریعہ ہندوستان میں رائج ہوا۔ اسی سلسلہ کی مشہور ہستیاں حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی اور حضرت علاء الدین شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں ذکر جہر اور ذکر خفی دونوں کا استعمال ہے۔ روح کو مراقبہ اور روزے سے پاکیزگی دی جاتی ہے۔ ان کے ہاں کلمہ شہادت پڑھتے وقت الا اللہ پر خاص زور دیا

جاتا ہے نیز اس سلسلہ میں سماع کا رواج ہے۔

(۲) نقشبندیہ

اس سلسلہ کی نسبت حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ہے۔ اس میں ذکر خفی اور مراقبہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف درجات سے ہوتے ہوئے وصالِ الٰہی حاصل کیا جاسکتا ہے اس سلسلہ کے ماننے والے موسیقی اور سماع کے سخت خلاف ہیں، نیز احکام شریعت پر سختی سے عمل کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

۳ قادریہ

یہ سلسلہ حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی سے منسوب ہے۔ اس میں ذکر اور ہر ماہ میں تین روزے رکھنے کا حکم ہے۔ اس کے ماننے والے شام و عراق میں بہت زیادہ ہیں۔ اس سلسلہ میں سماع کا رواج نہیں۔ سلسلہ قادریہ کے درویش حضرات عموماً سبز پگڑی پہنتے ہیں اور لباس کا کوئی نہ کوئی حصہ ہلکے بادامی رنگ کا ضرور ہوتا ہے۔ یہ حضرات درود شریف کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ان کے ہاں دونوں ذکر جائز ہیں۔

۴ سہروردی

اس سلسلہ کی نسبت شیخ حضرت شہاب الدین سہروردی سے ہے جنہوں نے یہ طریقہ حضرت جنید سے حاصل کیا۔ سہروردی حضرات سانس بند کر کے اللہ ھُوْ کے ورد کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ سلسلہ سہروردیہ میں ذکر خفی اور جلی دونوں کا رواج ہے یہ حضرات بھی سماع سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ ان کے ہاں تلاوت کلام پاک پر خاص زور دیا جاتا ہے۔

الغرض ان سب طریقوں نے اسلام کی اشاعت کی لیکن بعد میں جب ان کے معتقدین نے اصلی مرکز یعنی اسلام سے ہٹ کر تصفیہ قلب کی بجائے دنیاوی معاش اختیار کرتے ہوئے پیری مریدی کا ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کیا تو اپنی اہمیت کھو بیٹھے اور بعض لوگ ان حالات کو دیکھ کر تصوف سے بددل اور متنفر ہو گئے۔

ابن طفیل

اسلامی اندلس کا مشہور اور معروف فلسفی ابو بکر محمدؒ بن عبد المالک بن محمدؒ بن محمدؒ بن الطفیل، چوتھی ہجری کے آخر میں غرناطہ کے مقام پر وادی آش میں پیدا ہوئے خالص عربی نسل تھے اور عرب کے مشہور قبیلہ قیس سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض مورخین کے نزدیک ابن ماجہ اس کا استاد تھا لیکن ابن طفیل نے اپنے رسالہ حییّ بن یقظان میں لکھا ہے کہ ابن ماجہ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔

ابن طفیل نے غرناطہ میں کتابت کا پیشہ اختیار کیا اور اس میں یہانتک کمال حاصل کیا کہ امیر غرناطہ نے اسے اپنا کاتب مقرر کر دیا جب یوسف کا زمانہ آیا تو اس نے ابن طفیل کو شاہی طبیب پھر قاضی بعد ازاں وزارت کا عہدہ عطا کیا۔ بعض مؤرخین نے یہاں تک لکھا ہے کہ ابن طفیل امیر وقت کے اس قدر قریب رہتا تھا کہ اس کے کئی دن شب و روز محل میں گزرتے تھے۔

ابن طفیل نے اپنی اس عظمت سے علم و حکمت کی خوب خدمت کی اور اپنے زمانے کے کئی مشہور حکماء کو دربار میں جمع کیا جن میں ابن رشد بھی شامل تھا۔ جب امیر نے ابن طفیل سے ارسطو کی تالیفات کی تشریح کرنے کے لئے اس سے کسی عالم کو طلب کیا تو چونکہ ابن طفیل بڑھاپے کی وجہ سے اس کام کو سرانجام نہیں دے سکتا تھا اس لئے اس نے ابن رشد کا نام پیش کیا جو کہ بعد میں ثابت ہوا کہ نہایت موضوع ترین انتخاب تھا۔

تصانیف

ابن طفیل کی تصانیف میں طبیعات ا بعد الطبیعات۔ نفس۔ ریاضی فلکیات۔ فلسفہ اور شاعری سب شامل ہے۔ ابن طفیل کی تصانیف میں سے اہم ترین تصنیف جو انقلاباتِ زمانہ سے بچ سکی وہ "حیّ بن یقظان" ہے۔

"حیّ بن یقظان اور ابن طفیل

اس رسالہ میں ابن طفیل انسان کی تخلیق کے دو مختلف پہلو بیان کرتا ہے اور پھر اس کی عجیب و غریب پرورش کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص نظریہ علم پیش کرتا ہے جس میں وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ

۱۔ عقل خدا کو پا سکتی ہے۔

۲۔ عوام کے لئے عقلی فکر مناسب نہیں اور

۳۔ امام غزالی کے فلسفہ کا رد

"حی بن یقظان" میں ابن طفیل نے فلسفہ تصوف اور شریعت میں تطبیق پیش کی ہے ابن طفیل کے اس رسالہ کو فلسفیانہ حیثیت سے کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، اور دنیا کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ شائع ہوا۔ بعض مؤرخین کے نزدیک ابن طفیل نے اس رسالہ میں حکمت۔ طریقت اور شریعت کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔

وفات

ابن طفیل کی وفات مراکش میں ہوئی اور اسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے جنازے میں خلیفہ منصور نے بذات خود شرکت کی۔

حی بن یقظان

پیدائش کے دو نظریئے (۱) قدرتاً درخت یا خصوصی مٹی سے)

(۲) انسانی عوامل سے

پرورش:۔ حیّ کا جنگل میں اتفاقاً پہنچ جانا۔ ہرنی کے ذریعہ پرورش پانا۔ جانوروں سے اپنی حفاظت کرنا اور ہرنی کا علاج کرتے ہوئے حقیقت کا پا جانا۔

چونکہ حی نے ان تمام مواقع پر عقل سے کام لیا تو پھر کیوں نہ اپنی حیثیت تخلیق کائنات اور اس کا مقصد۔ نیز خالق و مخلوق کے تعلق کو سمجھا جائے اور اس پر عقل کے ذریعہ غور و فکر کیا جائے۔

امام غزالیؒ

آپ کا نام محمد لقب حجۃ الاسلام اور غزالی عرف ہے۔ امام غزالی خراسان کے ضلع طوس کے شہر طاہران میں ۴۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۰۵ھ میں طاہران میں ہی وفات پائی۔ آپ جب پیدا ہوئے تو چاروں طرف علوم و فنون کے چرچے تھے۔ جا بجا مدارس کا ایک سلسلہ تھا جو بغداد سے لیکر نیشاپور تک پھیلا ہوا تھا۔ غزالی کو جو زمانہ ملا وہ علمی اعتبار سے بہت اچھا تھا لیکن غزالی اور ان کے معاصرین میں بنیادی فرق یہی تھا کہ ان لوگوں نے فلسفہ حکمت اور مذہب میں بلا شبہ داد تحقیق دی ہے اور نہایت ہی بلند پایہ آثار قلم چھوڑے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں جس نے اپنے ذاتی تجربہ اور تجزیہ

انصافاً صحیح اور سچی تقلید کی ہو۔ امام غزالی اپنی فطرت اپنی زبانی کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

"چونکہ میری زندگی ابتدائی سے تحقیقات کی طرف مائل تھی اس لئے رفتہ رفتہ یہ اثر ہوا کہ تقلید کی بندشیں ٹوٹ گئیں اور جو عقائد بچپن سے ذہن میں جم گئے تھے ان کی وقعت جاتی رہی۔ جب میں نے سمجھا اور کہا کہ تقلیدی عقائد عیسائی اور یہودی سب ہی رکھتے ہیں جبکہ حقیقی علم اس کا نام ہے کہ کسی قسم کا شک و شبہ تک نہ رہے۔ مثلاً یہ کہ دس عدد تین سے زائد ہے لیکن اگر کوئی شخص کہے کہ یہ نہیں بلکہ تین زائد ہے اور اس کے ثبوت میں وہی شخص کہے کہ میں سچا ہوں اور میرا دعویٰ حق ہے کیونکہ میں عصا کو سانپ بنا سکتا ہوں اور وہ بنا کر دکھا بھی دے تو میں کہونگا کہ عصا کا سانپ بن جانا تعجب کی بات ہے لیکن اس سے اس یقین میں فرق نہیں آتا کہ دس کا عدد تین کے عدد سے زیادہ ہے۔"

تصانیف غزالی

آپ کی تصانیف کا دائرہ بے انتہا وسیع ہے۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ منطق۔ فلسفہ کلام۔ تصوف اور اخلاق۔ آپ نے اپنی تصنیف میں مضمون کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ کثرت تصنیف کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کی تصنیفات کو ان کی تصنیفی عمر پر تقسیم کیا جائے تو بقول علامہ شبلی سولہ صفحے روزانہ کا اوسط پڑتا ہے۔"

اور اگر مجموعی لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو یہ حالت ہے کہ تمام تصنیفات بلند پایہ مضمون پر مشتمل ہیں۔ ویسے تو سبھی تصنیفات کی ایک خاص منزلت ہے مگر چند تو ایسی ہیں کہ ان کو معرکۃ الآرا تصنیفات کہنا چاہیئے جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

تہافۃ الفلاسفہ

اس کتاب میں امام غزالی نے یونانی فلسفہ کے جو مسائل باطل کئے ہیں اس میں غزالی کے فلسفیانہ افکار کا پتہ چلتا ہے اور ان کی قوت تنقید و اجتہاد کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ امام صاحب نے اس سے بڑے ضرر کو جو فلسفہ کے انکار سے اسلام کو پہنچ رہا تھا نہایت آزادی سے ظاہر کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

ایک بڑا نقصان جو اسلام کو پہنچ رہا ہے کہ بہت سے لوگ اسلام کی حمایت کے یہ معنی سمجھتے ہیں کہ فلسفہ کے تمام مسائل کو مذہب کے مخالف ثابت کیا جائے لیکن فلسفہ کے

بہت سے مسائل دلائل قطعی سے ثابت ہیں اور جو شخص ان دلائل سے واقف ہے وہ ان مسائل کو قطعی سمجھتا ہے لیکن جب اس شخص کو یہ یقین دلایا جائے کہ یہ مسائل اسلام کے خلاف ہیں تو بجائے اس کے کہ ان مسائل پر شبہ ہو خود اسلام میں شبہ پیدا ہوتا ہے اس بنا پر ان نادان دوستوں سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے ۔"

۲۔ میزان العمل

یہ کتاب منطق پر ہے

۳۔ المنقذہ

اس کتاب میں امام غزالی اپنی روحانی واردات کی تشریح کرتے ہیں۔ اس کتاب فلسفہ کے تمام اقسام کی الگ الگ تشریح کی ہے

۴۔ احیاء العلوم

اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے :۔

پہلا حصہ عبادت کا ہے۔ دوسرا حصہ عادات کی تشریح ہے۔ تیسرا حصہ مہلکات پر ہے اور چوتھا حصہ منجیات پر ہے۔

امام صاحب نے فلسفہ اور مذہب کو ترکیب دے کر یہ کتاب تصنیف کی۔

تہافتہ الفلاسفہ کا ترجمہ ایرانی زبان میں ہوا اور شاہی کتب خانہ فرانس میں موجود ہے Munk and Schmoelders نے اس کتاب کے مضامین پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ علاوہ ازیں کیمیاء سعادت کے اخلاقیات کو جرمن زبان میں منتقل کیا گیا۔

امام غزالیؒ نے خود منطق، فلسفہ میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور صاف طور پر بتا دیا کہ بجز "الٰہیات" کے باقی تمام فلسفہ میں مذہب اسلام کے خلاف کوئی بات نہیں، صرف الٰہیات ہی مذہب کے خلاف ہے۔

۔ فارابی

دنیائے اسلام کا سب سے بڑا فلسفی محمد بن طرخان ابو نصر فارابی ترکستان کے شہر فاراب میں پیدا ہوا۔ آپ کے خاندان کا پیشہ سپہ گیری تھا لیکن آپ نے علوم و فنون کی طرف توجہ دی اور ۷۰ سے زائد زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ آپ نے منطق موسیقی

اور دیگر متعدد علوم پر تصانیف پیش کیں۔ فلسفیانہ علوم میں مسلمانوں میں کوئی شخص آپ کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکا اور یہ حقیقت ہے کہ ابن سینا نے آپ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے قابلیت پیدا کی۔

فارابی کے علمی مشاغل

فارابی نے دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی اور پانی کے چشمے یا سایہ دار باغ آپ کا ٹھکانا ہوتے تھے۔ آپ نے اپنی تصانیف کو الگ الگ صفحات پر لکھا۔ آپ دنیاوی آسائشوں سے بے نیاز تھے اور اپنی ضروریات کو چار درہم روزانہ تک محدود کر دیا تھا جو کہ سیف الدولہ کے دربار سے آپ کو مہیا کی جاتی۔

فارابی کا اصل کام تو منطق کی تشریح تھا لیکن آپ نے سیاست پر بھی توجہ دی۔ افلاطون کے قوانین کا خلاصہ مرتب کیا۔ جب کہ اخلاقیات میں ارسطو کی پیش کردہ اخلاقیاتی کتب کی شرحیں لکھیں۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ افلاطون اور ارسطو کے نظریات کو متحد کرنا ہے۔

فارابی اور نظریہ وجود باری

فارابی نے وجودِ باری کے سلسلے میں جو نظریہ پیش کیا ہے اسے ہم اپنے الفاظ میں یوں پیش کرتے ہیں۔

"ہر چیز کسی علت سے وجود میں آئی ہے اور خود یہ علت کسی پہلی علت کے سبب عالم وجود میں آئی یہاں تک کہ ہم ایک ایسی علت تک پہنچتے ہیں کہ جس سے پہلے کوئی علت نہیں ہوتی اور یہ علت ابدی ہوتی ہے۔"

نیز آپ نے فرمایا کہ:۔

ہر حرکت کرنے والی چیز کے لئے کسی نہ کسی محرک کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن محرک خود حرکت نہیں کرتی اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا جسم حرکت کرتا ہے اس لئے کہ اگر جسم سے روح کو نکال لیا جائے تو وہ غیر متحرک ہو جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ایسی ہستی ضرور ہے جو تمام محرکات کی محرک ہے اور وہ ہستی دائمی اور

بے مثال ہے۔"

فارابی نے نبوت۔ معجزات۔ وحی۔ ملائکہ اور یوم آخرت اور عبادات کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے بھی فلسفیانہ دلائل سے کام لیا ہے۔ وہ اپنے ایک رسالہ میں لکھتے ہیں کہ پیغمبروں کے معجزات حق اور ممکن الوجود ہیں۔ دعا حق ہے اور اس سے نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ خواب حق ہے۔ پیغمبروں کا علم غیب کی باتوں کا پتہ دیتا ہے۔ عبادتیں واجب ہیں اور انسان کو پورا کمال صرف علم و عمل سے حاصل ہو سکتا ہے۔

فارابی کی تمام نظریات اور تعلیمات سے یہ بات صاف طور پر واضح ہوتی ہے کہ فارابی نے فلسفہ اور ارسطو کے خیالات و اعتقادات کو اسلام کے قریب تر لانے کی کوشش کی ہے نیز فارابی کی تعلیمات سے ہم پر یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ پکا مسلمان تھا اور اس نے مذہب کی حمایت کی اور ملحدانہ نظریات سے بے تعلقی کا ثبوت دیا اور کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں علم کلام کی ابتدا بھی فارابی سے ہوئی۔



وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى

اور تم نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو

راہ نما

برائے

ایم، اے اسلامیات

سال اوّل

شہزادی شمع کریم۔ کراچی پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۸۹۰۸ کراچی